
مضامینِ عالم

جی۔ اے ساقی

ملنے کا پتہ

اُردو بک سٹال۔ ہال بازار۔ امرتسر

وزیر ہند پریس امرتسر میں باہتمام سردار بھوپندر سنگھ بی اے ایل ایل بی پرنٹر چھپا اور محمد انیس احمد پبلشر نے شائع کیا

عرضِ ناشر

ہمارے پاس اکثر ایسی سفارشات آئی ہیں جن سے یہ ضروری خیال کیا گیا ہے۔ کہ کہ اعلےٰ معیار پر دورِ جدید کے مطابق ہمیں کوئی نسخہ تجویز کرنا چاہیے۔ کیونکہ موجودات ادب میں بیشمار کتب کے باوجود مضمون نگاری کیلئے شائقین طلبا کو کوئی خاطر خواہ نسخہ نہیں ملتا۔ اور اگر کچھ کتب ایسی ملتی بھی ہیں تو اُن کی قیمت بیحد گراں، زبان ثقیل و دقیق ہوتی ہے جسکے مصنف اپنی ادبی کاوشوں کو سُلجھاتے سُلجھاتے مضامین کے علمی پہلو کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ اگرچہ چند اصحاب اسے صحیح زبان میں لکھتے بھی ہیں مگر دقیانوسی قسم کے مضامین مُرتب کر کے اپنے فرائض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ ضرورتِ وقت اور تقاضائے ادب یہ ہے کہ جس طرح موجودہ دورِ سیاست اور اقتصادیات بدل رہے ہیں۔ اُسی کے ساتھ ساتھ ہر زبان کے لٹریچر کے اندر انقلابات پیدا ہو رہے ہیں اور جنگ کے تاثرات نے ہر چیز پر اپنا اثر کر رکھا ہے۔ انسان ہر حالت میں جدت اور انوکھاپن کا متلاشی ہے۔ ہر علم و فن میں جدت پسندی کو پیار کیا جا رہا ہے۔ گانے کی سُروں کو لیجیے۔ میٹھے میٹھے گانے ہر فلم اور پروگرام کو کامیاب بنا رہے ہیں۔ اسی طرح فن نقاشی میں آرٹ اپنی تاریخ روز آپ بدلتا ہے۔ ہسٹری جغرافیہ کی امداد سے بنتی اور بگڑتی جا رہی ہے۔ سیاسیات، اقتصادیات سے امداد حاصل کر رہی ہے۔

الغرض فلسفہ اور سائنس ہر چیز میں اپنے جوہر دکھاتا نظر آ رہا ہے۔ جنگ کی پرانی طرزیں نئے انداز سے بدلی جا چکی ہیں۔ الغرض موجودات کے جس ذرے کو دیکھو۔ جدت پسندی کو اپنا نظریہ قرار دے چکا ہے۔ پرانے دور سے اختلاف ہر نئے دور کی ترقی

کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح اردو ادب میں اس امر کی ضرورت ہے کہ مضامین جدید طرز کے ہوں اور ان کا طرزِ بیان الگ ہو اور اُن کے اندر علم فلسفہ و دیگر ضروریات ادب کو ملحوظ رکھا جائے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادارہ ادب کی چند ایک چھوٹی چھوٹی کتابیں ایسی شائع کر کے شایقین ادب کی خدمت میں بہت کم ہدیہ پر پیش کی جائیں۔ جس کی پہلی کڑی **مضامینِ عالم** کے نام سے شائع کی جاتی ہے۔ اور اس کی دُوسری جلد جس کے اندر فکر و سیاست کے نام سے چیدہ مضامین شائع کئے جائیں گے۔ تیسری جلد میں فکر و علم کے چند مضامین شائع ہوں گے۔ چوتھی جلد میں رنگین مضامین کا ایک نہایت اعلےٰ مرقع شائع کیا جائے گا۔

اُمید ہے کہ ہمدردانِ ادب ہمارے اس ارادے کا خیر مقدم کریں گے۔ گو اس امر پر ہمیں فخر حاصل ہے کہ ہمارے ادارے کی ہر کتاب شائع ہوتے ہی ہر صاحب نظر کے پاس پہنچ جاتی ہے۔

محمد انیس احمد

اُردو زبان کی تاریخ

تواریخ عالم کی ورق گردانی سے پتہ چلتا ہے کہ ایشیا کی آرین قوم ہی سب کی والدین ہے۔ اس امر کی تصدیق ایرانی علوم۔ روما اور ہندوستانی کتب سے بھی ہوتی ہے کہ جب آرین ایشیا وسائبیریا کے جنگلات سے روزمرّہ کے مصائب کے ہاتھوں تنگ ہو کر برفانی علاقوں اور پہاڑی آبادیوں کو مستقل شہر بنانے میں ناکام رہے تو انہوں نے ندیوں نالوں کی رہبری میں میدانوں کا رُخ کیا۔ چند قبائل ایران کے میدانوں میں اُتر گئے اور کچھ ہندوستان میں آ گئے۔ ان کی زبان سنسکرت تھی۔ چنانچہ یہ لوگ ایران میں بھی اپنی زبان کے ہمراہ گئے +

ایران کے عیش وطرب نے اِن مسافروں کو جلد عشرت پسند بنا دیا۔ ضرورت وقت نے انہیں ملکی نظم ونسق کا حامل بنا دیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ آب وہوائے ایران نے اپنی تاریخی حیثیت کا بھی ثبوت دیا کہ جہاں خوب صورتی ہر پیدائش سے ٹپکتی ہے۔ وہاں اس کو چاہنے والے بھی ضرور پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایران میں عشق بازی۔ حُسن پرستی عوام کی ضروری غذا بن گئی تھی۔ چنانچہ تاریخ نے ہر شاہ ایران کی سوانح سے اس امر کو ظاہر کیا ہے۔ اِس لئے ایران کے لوگ عیاش طبع۔ عشرت پسند مشتاقانِ حسین تھے جس کا لازمی نتیجہ بزدلی نزاکت لپسندی۔ لطافت نوازی شروع ہو گئی۔ مردانگی و بہادری کے جذبات بالکل مفقود ہو گئے اور محنت وجفاکشی سے نفرت ہونے لگی +

اِن حالات کو دیکھکر ہر بیرونی حملہ آور آیا اور اس نے ایرانیوں پر بے شمار حملے کیئے۔ اس طرح تاتاریوں۔ ساسانیوں کے حملوں میں اُن کا تمدن۔ معاشرت و تہذیب بھی لُٹ گئی۔ چنانچہ ہوتے ہوتے اُن کی زبان پر بھی حملہ آور دوں کی زبان نے حملے کیئے۔ بتدریج ہر قابض و حکمران کی زبان محکوم زبان پر حکمرانی کرنے لگی۔ حتّیٰ کہ ایرانی اصلی زبان سنسکرت گُم ہوگئی اور عربی و فارسی کا دَور دَورہ ہوگیا۔

مگر ادھر ہندوستان میں سنسکرت کے حامی جب پہنچے تو کول۔ بھیل، دراوڑ اقوام کو مار لُوٹ کر اگلے صوبوں میں بھگا دیا۔ اور خود مختار ہو کر چھوٹے چھوٹے حلقوں میں اپنی اپنی جما بیٹھے۔ ہوتے ہوتے بھلی چنگی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ ہندو مت پیدا ہُوا۔ جس میں منو رشی آئے۔ اور انہوں نے چار ورن بنائے۔ جسکا نتیجہ کھتری۔ ویش۔ شودر۔ برہمن بن نکلے ؛

اُس نے حکم دیا کہ ماسوائے برہمن و برہمن زاد کے کوئی اور آدمی سنسکرت نہ پڑھے۔ نہ بولے۔ اِس طرح سنسکرت محفوظ دِلوں اور دماغوں میں قید کر لی گئی۔ ورنہ جس قدر ہندوستان پر حملے ہُوتے۔ یہ لازمی تھا کہ ایرانی زبان کی طرح اس کی ہست و بُود کا پتہ ملنا بھی مشکل ہو جاتا ؛

زمانے نے کئی رخ بدلے۔ ہندوستان میں بھی کچھ عرصہ سنسکرت مدھم پڑ گئی۔ یہ بالکل نہ کہا جا سکتا تھا کہ سنسکرت کے چاہنے والے موجود نہ تھے۔ دُوسرا دَور بدھ مت کے حامی شنکر آچارج جی کے ہوتے آیا۔ اُنہوں نے اِسے پھر چمکایا مگر ہندوستان کی اصل زبان کی چند بیٹیاں اُسوقت ہندوستان میں اپنے اپنے صوبوں

میں رائج کر رہی تھیں۔ جن کے نام اوڑیا۔ تامل۔ تلنگو وغیرہ ہیں۔ جن کا سنسکرت سے دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ پھر وقت نے بتلایا کہ مسلمان حملہ آوروں نے ہندوستان میں سات سو سال راج کیا۔ جب شاہجہان کا عہد آیا تو اُسوقت سنسکرت کی ٹوٹی پھوٹی زبان جو کہ عوام میں روزمرہ کا کام دیتی تھی۔ بنی۔ شاہجہان نے دہلی میں نیا قلعہ بنوایا۔ اس میں ہر علاقہ کے کاریگر بلوائے ہزاروں قسم کا لشکر جمع کیا۔ کچھ ایرانی، کچھ عربی کے ماہر بھی موجود تھے۔ سب نے مل جل کر آپس میں گفتگو شروع کی۔ ہر ضرورت مند ایک دوسرے کو کچھ اپنی زبان کے الفاظ اور کچھ دوسرے کی زبان سے ملا کر کہتا اور اپنا مطلب سیدھا کر لیتا۔ آخر اسی طرح گڑبڑ میں ایک نئی ترکیب پیدا ہوتی چلی گئی جس کا نام ریختہ (ملوبہ) رکھا گیا۔ یہ زبان ہر ان پڑھ کے لئے آسان تھی اور ہر مسافر دوسروں سے مل کر اپنا مطلب سیدھا کر لیتا تھا۔

ادھر راجہ بھرت کے عہد میں برج کے خطہ کی زبان وہ تھی جسے بعد میں برج بھاشا کا نام ملا۔ اب برج بھاشا اور ریختہ نے باہمی ملاپ حاصل کیا تو اُردو نام پیدا ہوا۔ دراصل اردو لفظ کے معنے لشکر ہے۔ چونکہ زبان لشکر کے جمع ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے اردو کا نام دیا گیا۔ اس زبان اردو نے شاہی دربار میں جگہ حاصل کر لی۔ عالمگیر کے عہد میں اس زبان نے خوب ترقی کی۔

پندرھویں صدی میں عربی فارسی اس پر پوری طرح چھا گئی۔ سکندر لودھی کے عہد میں کائستھ فارسی پڑھ کر شاہی دفتر میں شامل ہوئے۔ اکبر کے عہد میں دونوں قوموں میں اختلاط اس حد تک بڑھ گیا کہ فارسی بولنا فخر سمجھا جانے لگا۔

اس فعل سے ہر فارسی کے الفاظ کو اردو میں آنے کا زیادہ اچھا موقع مل گیا۔ پہلے پہل امیر خسرو۔ کبیر صاحب۔ گورو نانک صاحب۔ تلسی داس اور سور داس جی نے اردو نظمیں لکھیں۔ پھر معمولی کہانیاں مثنوی کے نام پر لکھی جانے لگیں۔ پھر نظم کو نثر کا جامہ پہنایا گیا۔ چہار درویش۔ باغ و بہار کے طرز پر قصے لکھے گئے۔ میر انشاء اللہ خاں نے قواعد اردو لکھی اور شاہ عبدالقادر نے اوّلیں قرآن مجید کا ترجمہ اردو میں کیا۔ پھر دفاتر سرکاری اردو ہو گیا۔ اور اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔

والد محمد حسین آزاد نے سب سے پہلا اخبار دلی سے نکالا۔ ۱۸۴۶ء میں دلی میں ترجمہ کرنے اور ضروری الفاظ بہم پہنچانے کے لئے ایک سوسائٹی قائم کی۔ آخر انگریزی سامراج کا وقت آیا۔ جس کے اندر زبان کی فن شاعری کو چار چاند لگ گئے۔ مرزا سودا۔ ذوق۔ غالب نے متاخرین کا رنگ بدل ڈالا۔ اندازِ بیان طرزِ تحریر میں اچھوتا خیال پیدا کیا۔ سادگی و سلاست فصاحت و لطافت نے زبان اردو میں زندگی پیدا کر دی۔

شعرا کے مختلف الخیال لوگوں نے چار گروہ بنائے ہیں۔ کئی صاحب تمیز اسکو پانچ دوریں تقسیم کرتے ہیں۔ چند ایک اس زبان کی صرف تین منازل شمار کرتے ہیں۔ علامہ شبلی تو اس کو شعر العجم میں صرف چار دوریں بیان فرماتے ہیں۔ اور جناب مولانا محمد حسین صاحب آزاد اس زبان کے ارتقا کو پانچ دوریں منقسم کرتے ہیں۔ آپ نے اس پر جامع کتاب آبِ حیات لکھی ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ ہر مفکر اور ہر ادیب اس امر پر متفق ہے کہ پہلے

پہل تو اہل اردو صرف سادہ گو اور سیدھا مطلب کہتے تھے جب دوسرے دور میں قدرے فارسی نے رنگینیاں پیدا کردیں تو معمولی تشبیہ و مبالغہ سے کام لیا جانے لگا۔ معنوں میں بھی قدرے الجھن و پیچیدگی پیدا ہونے لگی ؛

پھر تیسرے دور کے استادوں نے تو عشق و محبّت کو اس قدر لیا کہ بیان معشوق اور ذکر حبیب سے دواتوں کی سیاہی خشک ہونے لگی محض استعارہ و مبالغہ کی ترکیب و بندشیں پیچیدہ و دقیق شروع ہو گئیں۔ آخر چوتھے دور کے مالک آئے۔ انہوں نے اپنی الگ جمائی ؛ کچھ سادہ گوئی و تخطاب پسندی اور دقیق و رموز والی تحریر سے نفرت شروع ہوئی۔ قدرے نیچرل اور روزمرہ کی سی زبان پسند کی جانے لگی۔ الغرض ع

ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت۔ والا قصّہ ہی سمجھ لیجیئے۔

اسی طرح اس زبان میں بڑے بڑے مُدبّر اور صوفی شاعر بھی پیدا ہوئے۔ جن کا رنگ تمام زبان پر چھا گیا۔ حافظ۔ غالب۔ حالی نے تو زبان کو ایسے اعلےٰ درجے پر پہنچایا۔ جس کا نتیجہ آج زبان اردو میں نصائح سبق آموز طرزِ جدید کی نظم لکھنے کا ہر نفس شائق بن گیا ہے ورنہ زبان لچر پوچ ہی بن گئی تھی۔ عشق و محبّت کے اعافوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اِس دورِ جدید میں علامہ اقبال۔ حفیظ۔ حیدر آباد دکن کے شعرائے تو اِس زبان پر بے حد احسانات کئے ہیں جو مولانا عبدالحق اور دتاتریہ کیفی۔ عبداللہ کامل نے اس ادب کی خدمت کی ہے۔ اس کا احساس کئے بغیر نہیں رہ

جا سکتا۔ ان کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے کہ اس زبان میں ڈراما۔ تغزل۔ ادب اور ہر فن پر تراجم اور کتب شائع ہو گئی ہیں ؛

مشترکہ زبان پر تبصرہ

زبان اردو آج تمام ہندوستان کی مشترکہ زبان تسلیم کی جاتی ہے ہر ضلع میں مختلف تلفظ اور بالکل الگ زبان رائج ہے مگر ہر ضلع میں یہ زبان سمجھی جاتی ہے۔ چند متعصب اصحاب کا خیال ہے کہ یہ زبان صرف مسلمانوں کی ہے مگر یہ بات اس تاریخ کو پڑھنے سے غلط ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے اس زبان کو جس مدت کے بعد ہم ہندوستانیوں میں ہر دلعزیزی حاصل کی ہے بدلنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہر قوم کی ترقی کے لئے یہاں فوجی سیاسی سوشل ترقی کی ضرورت ہے وہاں اُس کے ذریعہ میں سے سب سے اعلےٰ ترقی کا وسیلہ اس مُلک کی مُشترکہ زبان ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایک زبان مُلک کی مُشترکہ نہ ہو تو آپ ہی بتلایئے کہ اُس مُلک کی ترقی تو درکنار اس کا بحال رہنا کس قدر مشکل ہے۔ ہاں اگر زبان کو بدل کر کوئی نئی زبان اُس کی جگہ جاری کی جائے تو فرمایئے۔ اس کو پڑھنے پڑھانے کے لئے ہندوستانی قوم و نسل کی کس قدر طاقت اور وقت ضائع ہو گا۔ وہ وقت جو نئی زبان کے سیکھنے اور سکھلانے پر ضائع کرنا ہے اگر ہمارے مُصلحین ہماری اصلاح پر صرف کریں گے تو فی زمانہ ہم کسی کنارے لگ سکیں گے۔ اگر ہماری کشتیٔ قوم کے ناخدا ہی تعصب سے زبان کی لڑائی پر بگڑے بیٹھے رہے۔ تو یہ یقینی بات ہے کہ ہماری قوم کی ناؤ ضرور اُن کی

خانہ جنگی سے کسی نہ کسی بھنور میں ضرور گھر کر رہ جائے گی ؞

ہماری پہلے ہی کونسی صورت قابل غور ہے جس پہ ہم ہندی ناز کرسکیں۔ جو ہماری زبان کی اُلجھن سلجھانی باقی ہے۔ اس لئے ہماری اس مُلکی بدحالی کو دُرست کرنے کے لئے کسی تنظیم کی ضرورت ہے اور اُسی تنظیم کے لئے ہماری خاص روزمرّہ کی مُشترکہ زبان بھی ضرور رہنی چاہئیے۔ وُہ صِرف اردو ہے۔ اِس لئے اردو سے پیار کرنے والے اپنے مُلک کے سچے خادم اَور مُلک کے وفادار سپاہی ہیں۔ باقی سب متعصّب اور مُلک کے مقصد کے راستہ میں زبان کے اعتراضات پیش کر کے منزل کارروان سیاسی کو کھوٹا بنانے کا باعث ثابت ہو رہے ہیں۔

الیکشن کس طرح جیتا؟

الیکشن (انتخاب جمہوری حکومت کا بنیادی اصول ہے۔ اِس انتخاب کے ذریعے عوام کی نمائندگی حاصل ہوتی ہے۔ اِنتخاب ہی ایسا ذریعہ ہے جس سے دُنیا کے بڑے فسادات اور فتنے ختم ہو جاتے ہیں۔ ورنہ ہر آدمی کے دِل میں یہ خواہش اُٹھے کہ مَیں ہی اسمبلی کا صدر بن جاؤں۔ ہر کوئی یہ تمنا رکھے کہ مَیں ہی سر سکندر پنجاب کا وزیرِ اعظم بن جاؤں:

مگر جب الیکشن ہوتا ہے تو اکثریت جسے ووٹ زیادہ دے۔ اُس کو مُنتخب کر لیا جاتا ہے۔ اس اصُول کو سب مان لیتے ہیں ورنہ اِس اصُول کی عدم موجودگی میں حکومت کا کام بالکل جاری نہیں رہ سکتا۔ یہ اصُول ہر سوسائٹی ہر جماعت اور کونسل میں ارفع اور مؤثر تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہی ایک صفت ہے جو کہ جمہُوریت کو زیادہ ہر دلعزیز بناتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس اصُول کی مشق مناسب طریق پر نہیں ہوتی۔ ہر سوسائٹی میں اِنتخاب دُرست اور صحیح نہیں ہوتا بلکہ اُس میں کچھ نہ کچھ بے اصُولی اور رعایت ضرور شامل ہوتی ہے۔ ورنہ صحیح انتخاب سے ہر جماعت، سوسائٹی اور حکومت مُستقل طور پر قائم رہ سکتی ہے کیونکہ صحیح طور پر اکثریت نے کسی کو اپنا حکمران منتخب کیا ہے تو اُس میں کسی طرح بھی کوئی قباحت و بُرائی نہیں ہو سکتی۔

اگر وُہ ناقص بھی ہو تو اُس کی حمایت میں جب اکثریت ہے۔ کوئی کسی طرح بھی اُس کے خلاف کچھ بگاڑ پیدا نہیں کر سکتا۔

آج کل زمانہ بھر میں اِنتخاب ہوتے ہیں۔ انتخاب کو جمہوری اصُول پر لڑنے کیلئے بڑے بڑے مکروفریب کرتے ہیں۔ اکثر اوقات تو صاحب ثروت طبقہ ہی کامیاب رہتا ہے اکثر عوام تو غریب ہوتے ہیں۔ اُن سے ووٹ لینے والے بہرحال امیر ہوتے ہیں۔ جاتے ہی حسب دستور اُن کو بڑی بڑی دعوتیں کھلاتے ہیں۔ پھر لوگوں کے جذبات اُبھارتے ہیں۔ کہیں کسی کو رعب کسی کو لالچ اور کسی کو فریب دیتے ہیں۔ آخر اپنا وقت درست کر لیتے ہیں اور اُلّو سیدھا کر کے یہ گئے وُہ گئے۔ پھر کچھ عرصہ کیلئے خاموش ہو جاتے ہیں۔ اچھے اچھے لوگوں کی رائے ہے کہ الیکشن لڑنا بھی ایک فن ہے اِس فن کے بڑے بڑے ماہر موجود ہیں یہ کوئی آسان اور سیدھا کام نہیں جو ہر ایک الیکشن لڑ لے۔ مَیں چند احوال پیش کرتا ہوں :۔

مسٹر شہاب الدین نے ایک دفعہ اپنی دورانِ گفتگو میں فرمایا کہ مَیں ضلع سیالکوٹ میں امیدوار اسمبلی بنا۔ مَیں نے بوری آٹا۔ دال۔ لکڑی مصالحہ و دیگر ضروری اشیا موٹر میں رکھ لیں اور اپنے حلقہ انتخاب میں ہر گاؤں میں ہر ووٹر کے گھر گیا۔ ایک ایک سے اکیلا ملا۔ اُن کو تعارف کرایا۔ لباس پورے دیہاتی کا تھا۔ سب نے مجھے دیہاتی وزیر خیال کیا۔ سب سے ملائم اور باسلیقہ گفتگو کر کے حلفیہ وعدہ لیتا اور دوسرے گھر چل دیتا۔ یہ کام مَیں نے ایک دو ہفتہ میں ختم کر لیا۔ آخر اس انفرادی مُلاقات کا اثر یہ ہوا کہ سب نے مجھے مل کر کہا کہ چودھری صاحب

آپ جب ہمارے ضلع کے داماد ہیں تو آپ ہم سب کے داماد ٹھہرے۔ بس آپ پر ہم ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہیں۔ صرف ووٹ کیا بلا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔ آخر مجھے بلا مقابلہ ہی اُن ووٹروں نے اسمبلی میں بھیجدیا۔ اسی طرح تین نشستوں سے چودھری صاحب بلا مقابلہ بہ یک وقت کامیاب ہوئے محض حُسنِ سلوک کی بنا پر۔ اور لوگوں کو اپنے سلیقہ سے اس قدر شائق بنا گئے کہ جب چاہیں اُن علاقوں میں کامیاب ہو جائیں ؛

اسی طرح ہمارے ایک معزز دوست نے پنجاب میں ایک انتخاب لڑا۔ جس میں آپکو بے حد قربانیاں کرنی پڑیں۔ اُن کی رائے ہے کہ جو آدمی بالکل صحیح ابن الوقت ہو۔ وہی کامیاب الیکشن کا اُستاد بن سکتا ہے ؛

میرے مشاہدہ میں یہ امر آیا ہے کہ انتخاب میں بیشمار فریب اور چالیں کرنی پڑتی ہیں۔

دو فریق باہمی مقابلہ میں آئے۔ مَیں بھی ایک طرف تھا۔ مخالف نے یہ اُڑادی کہ میرا امیدوار بلا ناغہ نماز نہیں پڑھتا۔ ہم نے اپنے امیدوار کی طرف سے چار مسجدوں کو سو روپیہ خیرات دلائی اور پانچوں وقت باجماعت نماز پڑھنے کی ہدایت کی۔ عید نماز دیہاتی غریب ووٹروں میں مل کر پڑھنے کی تلقین کی ؛

پھر مخالفوں نے یہ ہوا گرم کی کہ میرے امیدوار سرکاری آدمی ہیں۔ ہم نے اس کی طرف سے سوشلسٹ پارٹی کا اعلان کر دیا اور اُسے انقلابی و سرگرم ممبر تصدیق کیا۔ مخالف نے شاندار جلوس نکالا۔ مَیں نے چند

بدمعاش اُس کے جلوس کے ہمراہ کردئے جن بدمعاشوں نے میرے امیدوار کو خود گالیاں دیں۔ اِس بنا پر اُس کے جلوس میں ابتری پیدا ہوگئی۔ چند آدمی ہمارے حمایتی بن گئے۔ چند مخالف بن کر باہم تن گئے اور یہ آواز لگادی کہ لڑائی ہوگئی۔ خون ہو گئے۔ تمام جلوس والے بھاگ نکلے۔ اُمید وار بھی بُزدِل تھا۔ وکیل تھا۔ اُٹھ بھاگا۔ تمام ووٹروں میں اُس کی بُزدلی کا چرچا ہوگیا۔ اور جاہل لوگ اُس سے بدظن ہو گئے۔

اسی طرح مَیں نے خود ہی ایک تکیہ مسجد کے امام کو سمجھایا کہ کہو۔ مَیں خود اس مسجد کا مالک ہوں۔ کسی کا حق نہیں کہ اس کی آمدنی مجھ سے مانگے مگر جب تک ہم سمجھانے نہ آئیں۔ اُس وقت تک وُہ گرم رہے۔

آخر اس گرما گرمی میں لوگ بڑے جوش میں آگئے۔ اکثر کا یہ مطالبہ بن گیا کہ جبتک اُس مسجد کا فیصلہ نہ ہوگا ہم کسی امیدوار کو ووٹ نہ دیں گے۔ ہم نے چند حمایتی ووٹروں کو مخالف کے پاس بھیجا کہ وُہ فیصلہ کرادے۔ ہوتے ہوتے لوگ مخالف فریق کے پاس گئے۔ سب نے متفقہ اُس کو کہا کہ وکیل صاحب ہماری مسجد کا فیصلہ متولی سے نہ ہوگا۔ ہم کسی کی نہ سُن پائیں گے۔ وکیل صاحب مولوی صاحب کے پاس گئے۔ مولوی صاحب نے اُسے پاجی، بدمعاش، عیاش اور مکار کہا۔ اور کہا کہ اگر تو ایماندار اور پرہیزگار ہوتا تو مَیں تیری ہر بات قبول کرلیتا۔ مگر مجھے تیری عزت درکار نہیں۔ جا۔ راہ لگ اپنی۔ اُس کی بے عزتی نے اُس کو رائے دہندگان میں اور بھی ذلیل کردیا۔ پھر وُہی نمایندگان رائے دہندگاں کا وفد میرے امیدوار کے حضور میں آیا۔ مَیں نے

فوراً تاڑ کر کہا کہ میرے صاحب کے لیئے یہ بات بہت معمولی ہے مگر ہم اس کام کو الیکشن کے ووٹوں کی خاطر نہ کریں گے۔ میرے میاں صاحب نے کہا کہ ووٹ مجھے دو۔ نہ دو۔ مگر میرا اسلامی فرض یہ ہے کہ مَیں مسجد خانہ خدا کو اس سے ضرور واگذار کراؤں کیونکہ ہر فرد بشر کا حق ہے کہ مسجد کو مشترکہ جائداد عامہ خیال کرے۔ اگر کوئی ایسا کرنے سے انکار کرے تو مَیں سب سے پہلے اُس جگہ شہید ہونے کو تیار ہوں۔ ممبری کیا بلا ہے۔ میرا ایمان نہ جلئے ممبری جاتی ہے تو جائے۔

میرے امید دار جوش میں اُٹھے۔ جائے وقوع پر گئے۔ مَیں اور دیگر حواری ساتھ ساتھ تھے۔ پہنچتے ہی میاں صاحب نے مولوی کو بُلایا۔ پوچھا۔ کیا چاہتے ہو۔ ایمان یا شرک؟ مولوی پہلے ہی معاملہ میں ہاتھ رکھتا تھا۔ لرزتے لرزتے جواب دیا۔ ایمان! میرے میاں صاحب نے فرمایا۔ تو مسجد ایمان والوں کی ہے۔ تم اگر ایمان دار ہو۔ تو سابقہ سب حساب اہل محلہ کو دیدو۔ آپ کو کوئی حق نہیں کہ مسجد کا مال اِدھر اُدھر ضائع کرو۔ چنانچہ مولوی صاحب فوراً پاؤں پر آن پڑے۔ تمام دُنیا میں واہ وا شان والے امیدوار کی حمایت میں نعرے بلند ہوئے۔ ہر دلعزیزی کو چار چاند لگ گئے۔

اسی طرح ایک محلہ ایسے مخالفوں کا تھا جو کسی صورت میں اپنے نہ بنتے تھے۔ مَیں نے اُن کے لیئے یہ سوچا۔ کہ صبح اُٹھتے ہی سب کا چالان کمیٹی کے دارغہ سے کروا دیا۔ پھر ایک آدمی کو بھیجدیا۔ جس نے کہا کہ میرے امیدوار کو کہو کہ تجھے بچالے۔ آخر سب مصیبت زدہ لوگ مِلکر میرے میاں صاحب

کے پاس آئے۔ مَیں نے اکڑ کر پُوچھا۔ کہو میاں! تم سب محلے والے ہماری مخالفت کرو۔ اور پھر ہم ہی تمہیں چھُڑانے جائیں۔ یہ کہاں کی دوستی ہے؟ اُنہوں نے متفقہ فیصلہ کر لیا۔ اور متفقہ کہا کہ ہم سب آپ کو ووٹ دیں گے۔ مہربانی کرو۔ ہم غریبوں کو بچاؤ۔

میاں بولے۔ جاؤ۔ مَیں سب کو رہا کرتا ہوں۔ صبح داروغہ آئے۔ تو اُسے میری طرف بھیج دینا اور کہنا کہ میاں صاحب نے کہا ہے۔ یہ میرے آدمی ہیں۔ اِن کا چالان معاف کر دو۔ پھر کیا تھا۔ ہماری اور بھی بن گئی۔

آخر الیکشن کا دن آیا۔ ہر دو فریق اپنے اپنے خیمے نصب کر کے اپنی اونچی آوازوں سے نعرے لگانے لگے۔

کچھ ٹولے آئے۔ انہوں نے روپے مانگے۔ وہ مخالف سے دو روپے ووٹ کا سودا کر چکے۔ تو مَیں آیا۔ مَیں نے کسی ایک کو بُلا کر تین روپے کہہ دیئے سب نے کہا۔ ہم تین روپے لیکر ووٹ دیں گے۔ مخالف نے خوب قلیہ شوربا کھلایا مگر روپے تین کے چار کر دیئے۔ مَیں نے 5 کہہ ڈالے۔ آخر بڑھتے بڑھتے ۱۰ روپے تک معاملہ پہنچ گیا۔ اُس وقت تقریباً 3.5 منٹ ہو چکے تھے مَیں نے ایک ایک کر کے سب کو لیا۔ کہا یہ کہ جو ووٹ دیکر تصدیق کرا دے ووٹ مجھے ملا ہے تو باہر دوسرے دروازے پر میرا آدمی روپے لے کر کھڑا ہے۔ جب مَیں رومال ہلاؤں گا تو وہ دس دس دیتا جائے گا۔ وہ سب اس بات میں آ گئے۔ سب ۵۰ ووٹر تھے۔ ووٹ دے چکے تو الیکشن کا وقت ختم ہو گیا۔ اب وہ مجھے ڈھونڈھنے لگے۔ مَیں چیف ایجنٹ تھا۔ مُہریں لگوا کر

صندوقچی بند کروا۔ پولیس کے ساتھ بیٹھ کر کار میں گھر پہنچا۔
وُہ سب مار و مار کرتے میرے میاں کے گھر آئے۔ ہم نے ووٹ دیئے مگر روپے نہ ملے۔ مَیں نے نکل کر کہہ دیا۔ جاؤ پولیس میں رپورٹ کر دو۔ وُہ ہکّے بکّے واپس گئے۔ آخر میاں صاحب کا رُعب تھا۔ بڑے حواری تھے۔ کوئی بول نہ سکا۔
اِسی طرح ایک اور گروہ تھا۔ جن کو مَیں نے بھکا دیا۔ اور پانچ روپے فی ووٹ کہہ دیا۔ حالانکہ یہ ووٹ سب مخالف کے اپنے تھے جو کہ بن پیسے جانے والے تھے مگر ہم نے اپنے ووٹروں کو کہا کہ دیکھو سب نے پانچ پانچ وصول کر لئے ہیں۔ اب جھر دکھانا اور ووٹ پانچ کے نام پر میرے میاں کو دینا۔
اس گفتگو سے وُہ سب یہ سمجھے کہ ہم مُفت جا رہے ہیں۔ اِس لئے کہ ان کا میاں اُن سے بے ایمانی کر رہا ہے۔ سب کو پانچ مگر اُن کو کچھ نہیں لہٰذا جھگڑا لے کر دماغ میں گئے۔ خود بخود ناراض ہو کر ووٹ ہمیں دے گئے اِسی طرح کئی لوگ ہمارے بھرّے میں آ گئے۔
آخر انتخاب کا وقت ختم ہوا۔ گِنتی شروع ہوئی۔ تو شمار کنندگان میں مَیں بھی بیٹھا۔ سو سو کا بنڈل باندھا گیا۔ گنتے گنتے مَیں ایک افسر سے جھگڑ پڑا۔ اور دوسرے کے دو بنڈل اپنی سر رکھ لئے۔ اسی کشمکش میں کوئی سر نہ آسکا۔ جب آخری شمار ہوا تو میرا ۱۵۰۰ ووٹ زائد نکلا÷
خیال فرمایئے کس قدر شاندار۔ کامیابی مجھے نصیب ہوئی۔ جب تک الیکشن میں بے ایمانی۔ مکر و عیاری سے کام نہ لیا جائے۔ موجودہ نظام میں

کوئی امیدوار کسی قسم کے الیکشن میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

الیکشن لڑنے کی بڑی بڑی ترکیبیں ہیں۔ جن سب کا ذکر اس مضمون میں کرنا مشکل ہے۔ وہ تو ایک مکمل کتاب کا مضمون بن جاتا ہے۔ اس لئے مزید معافی چاہتا ہوں ÷

شرابی محفل کا مزا

جس قدر اوراق تاریخ سے پتہ چلتا ہے۔ اِس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ دنیا کے ہر تمدن کے ساتھ ساتھ شراب کا ذکر جاری رہا ہے۔ جس تہذیب و تمدن کو لو اسی میں اسکی موجودگی کا ثبوت ضرور ملتا ہے۔ کوئی صورت نہیں جو اِس بن دُنیا کی ہستی قائم رہ سکے ؎

روز ازل سے لیکر اب تک بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت آدم کو دُنیا میں آنے سے پہلے اور دنیا سے جانے کے بعد در بہشت میں بھی اس کا شراب سے واسطہ رہا ہے۔ ہر مذہب والے اس کو موجود لکھتے ہیں۔ گو ہر مصلح نے اس کی مخالفت کی ہے مگر اس کی عدم موجودگی میں نہ تو دنیا کی تاریخ کا پتہ ملتا ہے اور نہ ہی دُنیا کے ارتقا تمدّن کا اِظہار ہوتا ہے۔ جہاں دیکھو۔ شراب کا ذکر ہے۔ وہاں تہذیب و تاریخ کا ماخذ ملتا ہے۔ جہاں کہ ابتدائی دَور میں شراب کا چرچا تھا۔ تمام دُنیا کے چپہ چپہ میں شراب کا رواج تھا۔ ہر باشندہ اس کو پیتا تھا۔ ایران کی تاریخ۔ شاہان روما کی سوانح عرب کے وحشی۔ افریقہ کے جنگلی۔ امریکہ کے اصلی قبائل۔ انگلستان کے خانہ بدوش ہندوستان کے بھیل و دراوڑ۔ ایشیا کے ایرین۔ چین کے افیونی سب اس کا استعمال کرتے تھے۔ شراب سب ممالک کی گھٹی میں آ رچکی تھی۔ پے در پے دُنیا میں مصلحین پیدا ہوئے۔ جن کی بدولت گھٹتے گھٹتے شراب کی حیثیت و اہمیت کم ہوتی گئی تہذیب و تمدن کی ترقی ہوتی گئی۔ حتےٰ کہ تمام دُنیا کی وحشت ختم ہوئی اور تمدن دَور

اور ارتقا سوسائٹی کا آغاز ہوا۔ تمام دُنیا والے اِس سے متنفّر ہوتے چلے گئے۔ آج سوسائٹی میں شراب ایک حقیر محض بن کر رہ گئی ہے ؛

شرابی محفل کی نشست ہوتی ہے۔ سب دوست ایک دوسرے پر قربان و نثار ہو رہے ہیں۔ پینے والے پیار اور محبت کا پرچار کر رہے ہیں۔ جو میاں کسی وقت بھی زباں درازی سے کام نہیں لیتا تھا۔ وہ اس محفل میں سب کے برابر ہنسی ٹھٹھا میں پورا اُتر رہا ہے۔ دل اور دماغ سب کے گرم ہیں۔ ایک دوسرے کو بھائی۔ برادر۔ خان صاحب۔ میاں صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔ ذرا ترنگ زیادہ ہوئی۔ تو ایک نے دوسرے کو پیار بھری زبان میں میٹھی سی گالی دیدی۔ سُننے والے نے کہا۔ دیکھو۔ میر صاحب! تم مجھے گالی دوگے۔ میر صاحب او نہیں تم میرے بھائی ہو جو گالی تم کو دونگا وہ مجھے ملیگی۔ تجھ کو اگر بُرا کہا تو خود پہلے بُرا ہوں۔ تم کو اگر اچھا کہا تو خود اچھا ہوں۔ تم بھائی ہو۔ گالی کا مزا مجھے ملتا ہے اور گالی بھی مجھے۔ فکر کیا ہی پروا نہ کرو۔ بے تکلفی ہے۔ دیکھو۔ دُنیا میں ہم کسی کی فکر نہیں رکھتے۔ انگریز اگر حکومت کرتا ہے تو ہم بھی اس وقت حکومت کر رہے ہیں۔ جرمن والا اگر تباہی مچا رہا ہے۔ ہمارے مقابل آئے۔ تو ہم اس کے پرخچے اُڑا دیں۔

دوسرے زندہ دل بولے:۔ دُنیا کیا ہے۔ صرف شراب کا ایک گلاس۔ اُلٹ گیا تو دُنیا ختم۔ اگر مل گیا تو دُنیا مل گئی۔ میرے ایک گلاس میں دُنیا ہے۔ چاہوں تو رکھ لوں۔ چاہوں تو ضائع کردوں۔ لوگ کہتے ہیں۔ دُنیا بُری بلا ہے۔ اس سے پیار نہ کرنا چاہیے۔ تو ضائع کردوں کیا ؟ میرا گلاس بھی چلا جائے گا۔ نہیں میرا گلاس میرا پیمانہ صراحی کا متلاشی ہے۔ اس کو توڑ دوں۔ تو یاروں کی صحبت

کا چور بن جاؤں گا۔ میں نہیں توڑوں گا۔ دُنیا بُری ہو تو ہو۔ مگر میرا گلاس بُرا نہیں ہے۔ اس میں پیاری دُختِرِ رز۔ سُرخ پری شراب ڈالتا ہوں جس کو پی کر تمام دُنیا سے الگ بے خبر، بے خود بن جاتا ہوں۔ لاؤ اور دو۔ تاکہ دُنیا۔ سب سے بُری دُنیا کو چھوڑ دوں مگر اس گلاس کی گردش کو نہ چھوڑونگا۔

سب یار پُکار اُٹھے۔ کیا فلسفہ ہے۔ کیا شاندار تقریر ہے۔ میرے دوست! اگر تُو چاہے تو ہم تجھ کو جواہر لعل نہرُو بنا دیں۔ تو تو ابوالکلام سے بھی اعلیٰ مُقرر ثابت ہوگا۔ چھوڑ یار کانگرس کو نگرس۔ میری بات سُنو۔

تیسرے بولے۔ میں نے آج پہلی مرتبہ پی ہے۔ سمجھتا تھا کہ کڑوی ہے۔ بُری ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ بہت بُری ہے۔ حرام ہے۔ تو ضرور نقصان دیتی ہوگی مگر خدا کی قسم ایک گلاس سے میرا دماغ آسمانوں میں اُڑنے لگا ہے۔ دِل چاہتا ہے کہ اسی طرح پڑا رہوں۔ تم لوگ باتیں کرتے اور شراب پیتے رہو۔ میں اپنی مستی میں بیٹھا رہوں۔ واہ میر صاحب! کیا مزا ہے۔ یہ مزا میں نے خدا کی قسم ہرگز ہرگز پہلے کسی مجلس میں حاصل نہیں کیا۔ میں تو روز پیا کروں گا۔ دیکھو جناب شیخ صاحب! یہ شراب حرام پتہ نہیں کس لئے کہی گئی ہے۔ اس لئے نہیں کہ اس میں نشہ ہے۔ اس لئے بھی نہیں کہ اس پر خرچ زیادہ آتا ہے بلکہ صِرف اِس لئے کہ اِس کو پی کر انسان اگر بُرے کام کرنے جائے تو جو بُرا نتیجہ اُن کاموں کا ہوگا۔ اُن کو دیکھ کر اس کو حرام کہا گیا ہے۔ آپ اگر شریف آدمی ہیں اور ہماری محفل میں بیٹھے ہیں۔ یہاں سے اُٹھ کر گھر چلے جائیں گے تو کوئی بُری بات نہیں۔ اور یہ کوئی حرامکاری نہیں۔ بس شراب کے حرام کا فلسفہ اتنا ہی ہے ؛

کوئی عاشق طبع بولے۔ سنو بھائی! میری سنو۔ تم سب باتیں کرتے رہے میں چپ رہا۔ اب میری سن لو۔ نہیں تو میں سب کچھ خراب کر دوں گا۔ اور اٹھ کر چلا جاؤں گا۔

ساقی بولے۔ سوڈا لاؤ۔ ۲ بوتل اور لاؤ۔ کچھ کھانے کو لے آؤ۔ سیگرٹ کے دو پیکٹ لاؤ۔

عاشق مزاج بولا۔ سنو بابا۔ یہ لاؤ وہ لاؤ۔ چھوڑو کچھ نہ لاؤ۔ جو لانا ہے لاؤ۔ نہیں تو نہ لاؤ۔ مگر میری پہلے سن لو۔ سب۔ اچھا۔ اچھا۔ سناؤ! بھائی سناؤ! تو بھائی ان کو بھی بولنے دو۔

دیکھو۔ جب سے میں نے ان سے پیار شروع کیا ہے۔ آج تک کسی بات کو انکار نہیں کیا۔ اس نے موٹر کہی تو موٹر۔ اس نے ٹانگہ کہا۔ تو ٹانگہ۔ اس نے سوٹ مانگا۔ تو سوٹ۔ اس نے دولت چاہی تو دولت۔ الغرض جو مانگا۔ سو لا دیا۔ مگر جب ہم نے ایک بوسہ مانگا تو جھٹ منہ بگڑ گیا۔ ماتھے پر تیوری چڑھ گئی۔

دیکھو جی! میں خوب جانتا ہوں کہ یہ لوگ مجھے بیوقوف بنانا چاہتے ہیں مگر بناتے ہیں۔ میں جانتا ہوں اور ان کو کہہ بھی دیتا ہوں۔ کہ تم مجھے بیوقوف بناتے ہو۔ اپنا مطلب سیدھا کر لیتے ہو۔ مگر جب میرا سوال آتا ہے تو فوراً مجھے گھر جانا ہے۔ مجھے جلدی کا کام ہے۔ مجھے یہ ہے۔ مجھے وہ ہے کہہ کر ٹال دیتے ہیں۔

دیکھو جی! میں تو ہر طرح قربانی کرتا ہوں مگر وہ کس قدر بیوفا۔ بیقدر

بے پرواہ یار ہے۔ بولو۔ سب باری باری بتلاؤ۔ مَیں اسکا کیا علاج کروں؟

ایک یار۔ آپ اپنے دل پر قابو پائیں۔ اس کی پرواہ نہ کریں۔ جو مانگے۔ دے دیں۔ مگر خود کوئی سوال نہ کریں۔ پھر ایکماہ کے اندر اندر خود میری سرکار پاؤں نہ پڑے تو کہنا۔

واہ بھئی واہ! خوب کہی۔

عاشق ناشاد۔ مگر سنو تو یار۔ یہ مجھ سے ہوگا کیسے؟ مَیں تو ایک دن میں کئی بار اُسے دیکھنے کے لئے جاتا ہوں۔ یہ خوب سمجھتا ہوں کہ میرا محبوب بھی جانتا ہے۔ کہ مجھے سخت اور تیز لگن ہے۔ جبتک دیکھ نہ لوں۔ آرام نہیں ملتا۔ یہی تو وجہ ہے کہ جو چاہتا ہے۔ مجھ سے حاصل کرتا ہے اور فوراً چل دیتا ہے۔ اچھا کچھ اور بتلاؤ۔

سُن بھائی! تم عاشق ہو۔ تو سب صدمے اور دُکھ برداشت کرو۔ عاشق کا کام یہی ہے۔ جاؤ۔

یہ عجیب علاج ہے کہ عاشق جو بھی ہو۔ خود کو ذلیل رکھے اور معشوق جو بھی ہو۔ وُہ ہر وقت اپنی شان میں رہے۔ بھلا معشوق نے شان کی خدا سے رجسٹری کرائی ہوئی ہے کیا؟ جو با جی۔ ہم لوگوں کی کمائی اُڑائے۔ ہماری محنت کا روپیہ بیدردی سے خرچ کرے اسکا کیا حق ہے کہ وُہ کمانے والے کو ذلیل و خوار رکھے۔ عشق و پیار نہ ہوا۔ ذلت و خواری کا ٹھیکہ ہو گیا۔ چلو مَیں ایسا عشق کرتا ہی نہیں +

کوئی اور۔ نہیں تم یہ کرو۔ سب باتیں پُرانی بھول جاؤ۔ آیندہ اپنی خودداری کو قائم رکھو۔ تمہاری بات پہلے مان لے تو پھر تم اُسکی مانا کرو۔ ورنہ صبر و ضبط سے کام لو۔ نہیں ضبط ہو سکتا۔ تو قلب۔ جگر اُس کے سپرد کرو۔ چاہے ڈبو دے۔ چاہے پار لگا دے +

عاشقِ ناشاد۔ جاؤ۔ تم سب میرے یار کے خلاف ہو۔ میں ایسا ہرگز ہرگز نہ کرونگا۔ وُہ میری ایک نہ مانے۔ مجھے کُتّے کے برابر نہ جانے۔ میری پرواہ نہ کرے۔ نہ کرے۔ مگر مَیں مرد کا بچّہ ہُوں جو حکم وُہ دیگا۔ وہی کروں گا۔ اگر تھوڑی زندگی رہی تو اُس کے قدموں پر نثار کروں گا۔ نہ سہی۔ جو کچھ ہو گا مَیں بُرا ہُوں۔ بھلا ہو اُسی کا ہُوں۔ اُسی کیلئے جیوں گا۔ اُسی کیلئے مرونگا۔ وُہ بُرا ہے۔ آخر میرا ہے ؎

وقت کیا ہے ۔ ۱۲ بجے ہیں۔ کوئی نہیں۔ ابھی بہت سویرا ہے۔ پیؤ یار! چھوڑ کس بک بک میں لگے ہو۔ اور کوئی بات کرو۔ اس عشق کا ذکر چھوڑ دو ؎

دیکھو۔ سب کی صحت کا جام لو۔ سب کو برابر۔ ساقی۔ اگر تم نے زیادہ اعتراض کیا۔ تو مَیں زیادہ دونگا۔ چُپ رہو۔ آداب محفل کا خیال رکھو۔ جب سب یاروں کا فیصلہ ہے۔ تو سر جُھکا دو۔ تم کیا الگ رہو گے ؎

ساقی۔ دیکھو۔ بھائی! جب تک سب ختم نہ کر لو۔ کوئی اُٹھے نہ۔

سب۔ بہتر۔ بہت بہتر۔ خوب بھائی۔ ساقی کی مہر سے ہم نے آج خوب مزا لیا۔ انتظام بہت اچھا رہا۔ مگر کس کو ہوش تھا۔ جو کوئی خرابی محفل کا باعث بنتا۔ ہم سب کو شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ کیوں نہیں۔ سب دوست اعلےٰ تعلیمیافتہ ہیں۔ ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ ساقی صاحب کا شکریہ ادا کریں ؎

اچھا بھائی! پہلے باقاعدہ صدرِ مجلس چن لو۔ پھر باری باری صدر کی اجازت سے شکریہ ادا کرو۔

ساقی کے ہوتے ہُوئے اس محفل کا صدر ضروری نہیں۔ اوہو۔ ٹھیک ٹھیک چلو۔ ایک طرف سے باری باری شکریہ ادا کرو ؎

نہیں پہلے پرنسپل صاحب شکریہ کہیں۔ پھر دیگر پروفیسر صاحبان۔ ان کے بعد وکیل صاحب پھر بلنیر ـــــ صاحب

ساقی۔ سب نے بیحد اعلےٰ الفاظ میں میرا شکریہ ادا کیا۔ اس کا میں بیحد مشکور ہوں۔ علاوہ ازیں جو آپ نے مزاو ترنگ کے ہوتے ہوئے اپنے پر قابو رکھا۔ اس کا بھی شکریہ کرتا ہوں۔

دوسرے ہوٹل والے حضرات کا اور بہرہ صاحب کا جو کہ ہمیں serve کرتے رہے۔ نہایت اعلیٰ خدمت گار ہیں۔ جو مانگا۔ فوراً حاضر کیا۔ ان کو ایک روپیہ انعام۔ اور بل میری کوٹھی پر صبح بھیجدیا جائے۔

بل لاؤ۔ بل آیا۔ دستخط کر کے دیئے۔

بہرہ! دو ٹانگے لادو۔ سب گھر گھر چل دیئے۔ چرنیو۔ چرنیو۔ بانی۔ بانی۔ بانی ئی۔

تبصرہ

شراب اس لئے پیتے ہیں کہ کچھ دیر کیلئے بیخود ہو کر دنیا و مافیہا سے بیخبر ہو جائیں۔ جو تفکرات ہر وقت دامنگیر رہتے ہیں۔ ان سے کچھ وقت کے لئے نجات پالیں۔ اب میں حسب ضرورت ایک محفل کا ذکر کر چکا ہوں کہ شرابی محفل کا نزا بے حد پُر کیفیت ہوتا ہے مگر اس محفل میں دل و دماغ کو معطل کر دیا جاتا ہے:

سر کرپس

ہندوستان کی سیاسیات میں نہایت سمجھدار لارڈ کرپس ایک مفکر کی حیثیت سے تشریف لائے جس نے ہر طبقہ سیاست سے کافی کہنے سننے کے بعد اپنی رائے کا اظہار کیا مفکران فرنگ نے جسکو بیرکار یگر سمجھکر ہندوستان کی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کیلئے مقرر کیا وہ بالآخر ناکام لوٹ گئے۔ اُن سے ملنے والوں میں تین قسم کے لوگ شامل ہوئے۔ ایک تو وہ حضرات جن کو سیاست حاضرہ نے حالات ہند پر گفتگو کیلئے منتخب کیا۔ وہ اپنی ذمہ داریوں کا صحیح احساس دیکھتے ہوئے ملتے اور مسائل و نقاط گفتگو پر غور کرتے تھے۔ دُوسرا گروہ ایسے صحاب کا تھا جن کو حکمران اور تجربہ کار افسران ہند سمجھکر لارڈ کرپس نے بُلوایا۔ انہوں نے بھی اپنی آیندہ حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر بات صاف صاف کہنے کی کوششیں کیں۔ تیسرے کچھ دوست شوقین مقدمات تھے جو صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ ہم بھی میدان سیاست میں دسترس رکھتے ہیں۔ جنہیں نہ تو لارڈ کرپس کی ہستی اپنی طرف مائل کر سکی اور نہ ہی وہ لارڈ موصوف کو کچھ کہہ سکے۔ اور نہ ہی کوئی کہنے کی چیز اُن کے پلے تھی۔ پہلے دو گروہ کی ملاقاتوں کا نتیجہ، یہ موجودہ کرپس کی تجویز کے الفاظ کی صورت میں نظر آتا ہے مگر تیسرے قسم کے لوگوں کو بھی سیاست میں ضرور شامل کرنے پر مجبور ہوں کہ وہ لوگ بھی بطور لیڈران نامعلوم یا نام نہاد طبقات کے نمایندہ بن کر لارڈ موصوف سے ملے ہیں مگر اُنکی گفت و شنید کا نتیجہ نہ تو لارڈ کی تجویز کے کسی حصہ میں نظر آتا ہے اور نہ لارڈ موصوف نے کسی جگہ الگ بیان دیا ہے۔ خیر، اِن حضرات سے پھر کسی میدان میں دو چار کہوں گا۔ اب مَیں اپنے مضمون کو زیر قلم لاتا ہُوں۔

آجکل تمام اخبارات اپنی اپنی رائے کا اظہار کر دیتے ہیں۔ ہر طبقہ سیاست کا مدبر اپنی اپنی رائے کہہ رہا ہے۔ کافی بیانات میری نظروں سے گذرے ہیں۔ ان سب واقعات کے بعد میں ابھی اور انتظار کرنے کیلئے تیار تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی آخری شکل لارڈ موصوف کی تجویز کی نکل آئے تو اس کی روشنی میں رائے زنی کروں مگر اب اس معاملہ پر جس قدر تیزی سے بحث وتمحیص ہو رہی ہے۔ اس پر تبصرہ کئے بغیر بن نہیں پڑتی۔

ہم خود یا کسی اپنے ساتھی لارڈ موصوف سے ملنا کوئی ضروری خیال نہیں کرتے۔ کیونکہ جہاں تک فیشن ایبل لیڈری کا تعلق ہے۔ اگر ہمیں باقاعدہ لیڈر کہلوانا ہے تو لارڈ مذکور سے ملنا ضروری تھا۔ مگر نہ تو ہم خود کو ماہر سیاست اور نہ ہی فیشن ایبل لیڈر بنانا چاہتے ہیں۔ ہم تو صحیح واقعات اور صحت حالات کے روبرو مسائل سیاست ہند پر ایک تنقید لکھنا چاہتے ہیں تاکہ ہمارا نقطہ نظر عوام پر واضح ہو جائے۔

آج میدان سیاست کی شاہسوار جماعت کانگرس نے اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے جس کے اندر کئی نقاط ایسے ہیں جن سے انتہا پسند عناصر شدید ناراض ہو جائیں اور بعض نقاط ایسے ہیں جو صرف ہندی سرمایہ داری کیلئے مفید نظر آتے ہیں جس سے ہندی مزدور کسان ناراض ہو جائیں گے جن کی آبادی اکثریت میں ہے۔ مگر مجھے اس تجویز پر غور کرتے ہوئے دو تین نقاط ایسے نظر آتے ہیں جن میں شہنشاہیت برطانیہ کے تدبر و فسوں کاری پر کچھ حرف آتا دکھائی دیتا ہے۔

جب مدبران سیاست فرنگ شہنشاہت پرستی کا خیال رکھتے تھے تو ان کو مرض سیاست کا صحیح نسخہ تجویز کرنے سے پیشتر تقاضائے وقت اور مرض کا صحیح پتہ لگانا چاہئے تھا۔ اگر میں یہ تصور کر لوں کہ مفکران سیاست فرنگ صحیح مرض سے واقف

تھے تو مجھے میری عقل سے اس مسئلہ پر امداد نہیں ملتی۔ کیونکہ ہندوستان میں فرقہ دارانہ نیابت کے باعث سیاسیات میں کوئی الجھن یا بدامنی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو ساری مرض وشکایت اقتصادی انقلاب دنیا کے تاثرات کے باعث پیدا ہوئی ہے۔ جسکا علاج معالج فرنگ نے لارڈ چرچل اور لارڈ ایمری کے بیانات اور لارڈ کرپس کی شکل میں فرقہ دارانہ تنازعات کو فرد کرنے کیلئے ہندوستان میں بھیجا ہے جن کا نسخہ بھی غلط۔ یہ اگر ہندوستان میں ایکا ندارہی سے علاج تلاش کرنے آئے تھے تو اُن کی تلاش غلط۔ اگر مفکران نے ان کو فرقہ دارانہ نیابت کی کوئی مشترکہ نیابت یا باہمی تقسیم نیابت کا حل ڈھونڈنے بھیجا ہے تو بھی غلط اور غیر مفید ثابت ہوئے ہیں کیونکہ اگر ان کو کوئی فرقہ دارانہ نیابت کا حل مل بھی گیا تو کیا ہندوستان سے جسقدر حکومت برطانیہ امداد حاصل کرنا چاہتی ہے یا شہنشاہت جسقدر امن وامان سیاست میں چاہتی ہے قائم ہوگا؟ نہیں۔ ہرگز نہیں کیونکہ اس بدامنی کے مرض کی اصل وجہ یہ تھوڑی ہے کہ فرقہ دارانہ نیابت کا کوئی حل نہیں نکلتا بلکہ صحیح مرض تو اقتصادیات میں گرمی۔ نرخ مشقت میں نرمی۔ ضروریات کی اشیا کی قیمت میں تیزی وغیرہ ہوگا جس کے تاثرات سے ہندوستان کا کوئی فرد نہیں بچ سکتا بلکہ اس اقتصادیا کے مرض کا شکار ہو کر ہر طبقہ اور ہر پیشہ اپنے آپکو موجودہ اقتصادی انقلاب کا راندہ اور برباد کیا ہوا مجروح اور زخمی سمجھتا ہے۔ ہر ہندوستانی محنت فروش، جنس فروش اور سرمایہ فروش چاہتا ہے کہ ان کی اقتصادیات کا صحیح لائحہ عمل تیار ہو جائے۔ مذہبی نیابت یا فرقہ دارانہ نیابت سے ہندوستان کی غربی دور نہیں ہو سکتی جب تک غربی کو دور کرنے والا صحیح علاج تجویز نہ ہوگا۔ اُس وقت تک ہندوستان کا ملیہ دستور العمل قابل عمل اور پرامن نہیں بن سکتا۔

ہاں اگر یہ سمجھ لیتا ہوں کہ سیاستدانِ فرنگ اس مرض سے صحیح واقف نہیں - اور اس کے باوجود انہوں نے لارڈ کرپس کو ہندوستان بھیجا ہے تو توضیع اوقات کے علاوہ لارڈ کرپس کی حیثیت نظر نہیں آتی - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پارلیمنٹ اور شہنشاہیت نے غلط سمجھا - انہوں نے ہمیں اس قدر نکما اور ناسمجھ خیال کیا کہ ہم ان کی اس بازیچۂ طفلانہ کے راز کو نہ پا سکینگے - حقیقت پر غور کیا جائے تو حالات فریب دہ اور مکروہ نظر آتے ہیں شہنشاہیت پرستوں کی نیت پر شک و شبہات پیدا ہو سکتے ہیں کہ وہ دراصل ہندوستان کے مرض اقتصادیات کا صحیح علاج سوچنے کیلئے تیار نہیں - اگر وہ اقتصادیات کو درست کا صحیح اور نیک ارادہ رکھتے تھے تو لارڈ کرپس کو فرقہ دارانہ مسائل کا حل سوچنے کی ڈیوٹی دیکر نہ بھیجنا چاہیے تھا بلکہ سیاسیات ہند میں امن قائم کرنے کیلئے اقتصادیات ہند پر کوئی صحیح دستور العمل تجویز کر کے بھیجتے -

گو یہ بات کہنے کو کسی حد تک درست نظر آتی ہے کہ جب شہنشاہیت اس موجودہ تجویز میں واضح کرتی ہے جو اسمبلی ریاستی اور انگریزی نمایندگان کی منتخبہ مرتب ہو گی - اور جو لائحہ عمل یا دستور اساسی وہ تجویز کریگی شہنشاہیت اسے پیارا قانون سمجھے گی - مگر جب اس قانون ساز مجلس کی پیدائش ہی برخود غلط ہو گی تو اسکی پرورش اور اس مجلس کی صحت سے کب صحیح العمل امن والا قانون بن سکتا ہے کیونکہ جس مجلس کے تمام رکن فرقہ دارانہ ووٹ کی نمایندگی حاصل کر کے منتخب ہوں گے وہ یقیناً ہر وقت اپنے اپنے ووٹ کی حفاظت کیلئے ہر مسئلہ کو فرقہ پرستی اور فرقہ دارانہ انداز میں وزن کر کے تولنے پر مجبور رہے گا - ہر وقت فرقہ پرستی کا ثبوت اس کے قول، عمل اور فعل سے ملتا رہے گا جس کا نتیجہ یقیناً ہندوستان کی سیاست میں فرقہ دارانہ

فسادات - فرقہ دارانہ تنازعات - فرقہ دارانہ حقوق کے مطالبات ہر وقت قائم رہیں گے - مگر عوام کو غلط لڑائی لڑتے لڑتے آخر تھک کر اس جھگڑے کو ایک دن چھوڑ دینا پڑے گا - لیکن اس عرصہ تک اقتصادیات بند اور زیادہ خراب صورت اختیار کر چکی ہو گی - اس لئے اس بحث کے بعد آپ میری معمولی سی تجویز پر بھی غور کریں - پھر اگر قابل قبول ہو تو اس تجویز کو بلا تعصب اور بلا امتیاز مذہب و فرقہ آپ اس پر غور کریں تو شاید ہم مل جل کر کسی صحیح راہ عمل تک پہنچ سکیں -

اِن الفاظ تمہید کے ساتھ مَیں اب ہندوستان کی صحیح حالت پر مختصر سی تنقید معہ تجویز دستور العمل لکھتا ہوں تاکہ مفکرین سیاست اس پر طبع آزمائی کر کے کسی نیک اور صحیح مستقبل کو حاصل کر سکیں +

— ○ —

ہندوستانی مسئلہ نیابت کا واحد حل

ہندوستان ایک کاشتکار ملک ہے ۔اس کی اکثر آبادی کاشت پر گذارہ کرتی ہے ۔ حکومت سرمایہ پرستانہ ہے جسکی انتہائی ضروریات اس کو مجبور کرتی ہیں کہ حکومت اپنی ہر ضرورت کے پیش نظر اپنی پرجا سے اپنی ہر ضرورت کو پوری طرح حاصل کرے +

موجودہ جنگی تاثرات نے اپنے شہنشاہ کو اس قدر مجبور کیا کہ حکومت ہند سے ہر قسم کی امداد مانگے جو کہ کم و بیش میسر آئی مگر سرمایہ داران ہند کو خلافِ اُمید اس جنگی مانگ نے بیحد تنگ کر ڈالا ۔ حکومت نے اُن سے فنڈ مانگے ۔ بے پناہ غلے ۔ کچا مال ۔ پکا مال مانگا ۔صوبہ دار آدمی مانگا ۔جس سے ہر صوبہ وار حکومت بھی اپنی اپنی حالت پر بار بار غور کرتی رہتی ہے ۔ہر تاجور اپنی حسب توفیق حکومت کا امدادی رہا دنیا کے مقابلہ بازی کے اصول نے ہر ملک کے سرمایہ داروں کو غیر ملکی سرمایہ دار کے مقابل میں سستی چیزیں فروخت کرنے پر مجبور کردیا ۔جس کا پس منظر یہ تھا ۔کہ کچا مال تو تقریباً انٹرنیشنل تجارتی نرخ و اصول کے ماتحت ایک دام ہی رہا ۔مگر مزدوری ہر ملک کی دوسرے ملک کے مقابلہ میں گرتی رہی ۔

یہی سرمایہ گری کے جنگ کا نتیجہ سرد بازاری رہا ۔ گاہک پیدا کرنے کی خاطر دن بدن نرخ گراتے گراتے ہر ملک کے مزدوروں اور کاشتکاروں کی شرح مزدوری اور شرح پیداوار سرمایہ داروں اور خریداروں نے گھٹایا۔

جس کا لازمی نتیجہ تمام دُنیا کے سرمایہ داری ممالک میں مزدوروں اور کاشتکاروں میں بیداری یا بیکاری گرم سے گرم تر ہوتی گئی۔ چنانچہ تمام دُنیا کے پہلو بہ پہلو ہندوستان میں بھی ویسی تاثرات مقابلہ بازی پیدا ہوئے جس سے حکومت گھبرائی اور یہ سمجھی کہ جس طرح ہو سکے ۔ کانگرس (سرمایہ داری) کی جماعت کو اپنایا جائے جو کہ عوام میں بڑھتی ہوئی بیداری کو روک سکے ؛

البتہ حکومت کے مفکرین نے کانگرس مدبرین سے مل کر عوام کو یہ مشورہ دیا کہ کہ ہم آپ کے حالات اور معیار معاشرت کو درست کرنے کیلئے مشترکہ وزارتیں قائم کردیتے ہیں تاکہ پبلک نمایندے مل کر حکومت کریں اور عوام کو جو تکالیف وشکایات غیر ملکی حکومت کے رویہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ قومی حکومت کے جاری ہونے سے وہ تمام دُور ہو جائیں۔ مگر طرز حکومت اور عملداری میں فرق نہ پیدا کرنے دیا جس کا لازمی نتیجہ **ڈیڈ لاک** تھا۔ سو پیدا ہو گیا۔ کیونکہ کاشتکار اور مزدور عوام حکومت سے قومی حکومت سمجھکر کچھ رعایات اور ترقی پسندانہ اصلاحات چاہتا تھا مگر حکومت اور حالات سے مجبور قطعاً قطعاً کوئی رعایت نہ کر سکتی تھی اور نہ ہی عوام کی تسکین کیلئے کوئی کام کر سکتی تھی۔ اس لئے وزارتیں نہ چل سکیں۔ چنانچہ کانگرس کو اپنی اہمیت قائم اور پوزیشن برقرار رکھنے کیلئے حکومت سے برطرف ہونا پڑا۔

آخر کانگرسی مدبرین سرمایہ دار تھے۔ انھوں نے شہنشاہی نظام کو برباد ہوتے دیکھکر اپنی تباہی کا خطرہ بھی نظر آتا تھا۔ لہذا انہوں نے فی الفور عوام ہند کے دل و دماغ پر قابض ہونے کیلئے حکومت سے الگ ہو کر مصنوعی رنگ اور انفرادی ستیہ گرہ شروع کردی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ملک میں انتہا پسند عناصر کی ترقی محدود ہو گئی اور عوام کی نگاہیں ان مدبرین کانگرس کے پروگرام پر ہی لگی رہیں۔

آج ہندوستان اس حالت میں ہے۔ ہر فرقہ پرست جماعت براہِ راست حکومت سے اپنی اپنی قوم کیلئے حقوق مانگ رہی ہے۔ اُدھر اقتصادیات کے ہاتھوں عوام حکومت سے بیزار ہو رہے ہیں۔

ایک طرف حکومت بیوپاری اور سرمایہ داروں کے خلاف حسب توفیق قانون تحفظ مزدور بناتی ہے تو سرمایہ دار ناراض ہو جاتے ہیں۔ اگر حکومت حفظ سرمایہ داری کے لئے کچھ کرتی ہے تو پبلک ناراض ہوتی ہے۔

اس صورت میں کانگرس ایک ضدی بچے کی طرح نہ تو سیاست غیر ملکی کو صاف صاف سمجھتی ہے اور نہ ہی اپنی آزادی کے لئے کوئی صحیح راستہ تلاش کر سکتی ہے۔ ہاں چونکہ انگریزی حکومت ہے۔ اس کے خلاف رہنے سے کچھ نہ کچھ عوام میں اظہار خلافت ہوتا ہے۔ اس لئے انفرادی ستیہ گرہی جنگ جاری رکھی مگر اب جبکہ حکومت ہند کچھ مزید جنگی مصائب سے دوچار ہوئی تو کانگرس کی پالیسی پھر وہی اپنی رٹ ہے کہ ہم نہ تو حکومت کی حمایت کرتے ہیں اور نہ ہی مخالفت۔ کیونکہ حالات کی گرمی سے سمجھ یہ آئی کہ اگر حکومت سے اسی طرح چھیڑ جاری رکھی تو عوام کو یہ رفتارِ جنگ پسند نہیں آتی۔ پھر ممکن ہے۔ اندر ہی اندر کوئی اور انقلابی سرگرمیاں جاری ہو جائیں۔ جس سے عوام کی ذہنیت انقلابی ہو جائے اور حالات تو انقلابی ہو ہی رہے ہیں تو ملک کی رہنمائی کی باگ ڈور یقیناً کانگرس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔

آج پھر کانگرس اس پر غور کر رہی ہے کہ آیا حکومت سے مصالحت کر لی جائے اور جنگ میں امداد دے دی جائے تو اس صورت میں عوام میں ہماری ساخت رہیگی یا کانگرس حکومت کی امداد نہ کرے تو بن پڑے گی۔ اب اس موجودہ دَور

میں نہ تو کانگرس سے مسلم لیگ ہی راضی ہو سکتی ہے اور نہ ہی عوام کا اعتماد ایسے حاصل ہے اور نہ ہی حکومت اس امر پر اعتبار کرتی نظر آتی ہے کہ وہ کسی قومی جماعت پر ایمان و یقین رکھکر مصالحت کرے اور حکومت ہند کا تمام اختیار مرکزی اُس جماعت کو عطا کر دے ؀

ایکطرف مدبران انگلستان ہندوستانی عوام کو آلہ کار بنانا چاہتے ہیں وہ یوں کہ پارلیمنٹ میں ایک پارٹی اعلان پر اعلان کرتی جارہی ہے کہ ہندوستان کو بالکل مکمل آزادی دینے کیلئے کوئی نہ کوئی قدم اُٹھایا جائے اور دوسری طرف حکمران حضرات ٹھوک کر جواب دیتے ہیں کہ جب تک ہندی مُدبران باہمی فرقہ دارانہ تنازعہ ختم نہ کرلیں ہم ہندوستان کو کچھ نہیں دے سکتے۔ حالانکہ ہندوستان کو اگر ایک منٹ کے لئے اس پر متفق بھی کرلیا جائے کہ وہ باہمی فرقہ دارانہ نیابت کا کوئی حل حدِ فیصلہ میں لے آئیں تو کیا حکومت برطانیہ کی تسلی ہو جائے گی اور کیا اُس حل سے عوام کی انفرادی اقتصادی تسکین بھی ہو جائے گی۔ میری سمجھ میں اول تو فرقہ دارانہ نیابت کا حل ہونا ناممکن ہے بلکہ یوں کہہ لیا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا کہ فرقہ دارانہ حل کے لئے فرقہ دارانہ نیابت کے مسئلہ کو دستور العمل ہندوستان میں مستقل امن قائم کرنے کیلئے سوچنا ہی غلط ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں اگر فرقہ دارانہ حل کے ہی جھگڑا کو متنازعہ امر اور باعث نفرت خیال کیا جاتا ہے۔ تو کیا جب سے لارڈ مانٹیگو چیمسفورڈ کی سکیم جاری ہوئی ہے۔ اُس وقت سے آج تک کیوں خاموشی رہی کیا اس طویل عرصہ میں اگر یہ امر قابل تسکین تھا۔ کسی قسم کا اعتراض پیدا نہ ہو سکا تو آج ہندوستان کی دُنیا میں کونسی نئی قیامت پیدا ہو گئی جس کے باعث ہندوستان کی پبلک کی رائے بدل گئی ہے اور ہر فرقہ اپنی اپنی شہرت

مذہبیت کیلئے خاص حقوق طلب کرنے کیلئے تیز روی سے کام لے رہا ہے۔

میری رائے میں تو ہر فرقہ پرست نیابت مانگنے والی جماعت ہندوستان کے ملک و قوم کی دشمن ہے۔ ہر ہندوستانی سے غداری کر رہی ہے بلکہ حکومت ہند کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہی ہے کیونکہ عوام کو ہندو مسلم سکھ حقوق کی کمی بیشی قطعاً غریب وامیر یا فاقہ مست نہیں بنا رہی بلکہ اس بیکاری و فاقہ مستی کا باعث سرمایہ داری کی ترقی اور حکومت کی ضروریات کا حد سے بڑھ جانا ہے اور عوام کی محنت و مزدوری کا سستا ہو جانا ہے اور کاشت کار کی پیداوار و جنس کا نرخ نرم ہو جانا ہے۔ اس لئے جو کچھ صوبہ دار حکومتوں نے ٹریڈ یونین ایکٹ اور ٹریڈ ایمپلائی ایکٹ بنائے ہیں۔ یہی صحیح علاج ہی وہ حکومتیں کسی حد تک صحیح معالج ثابت ہوئی ہیں۔ جن قوانین کی طفیل ہر فرقہ کے مزدوروں نے اپنی اپنی جماعت بندی کر لی ہے۔ ہر پیشہ کی جماعت الگ الگ بن چکی ہے۔ ہر اہل پیشہ اپنی ترقی اور بہتری کی سوچ و فکر میں پڑے ہیں۔ یہی وہ نیابت ہے جس کو قدرت حالات تمیز و امتیاز کی شکل میں دن بدن پیدا کرتی چلی جا رہی ہے۔ وقت آرہا ہے۔ جو ہر حکومت اس مسئلہ کی اہمیت پر غور کرنے کیلئے مجبور ہو رہی ہے۔ آج حکومت کو اگر مسلم لیگ۔ ہندو سبھا یا سکھ لیگ یا کانگریس بھی فرقہ وارانہ یا قومی مشترکہ انتخاب کرنے کی اصلاحات لینے دینے کی پٹی پڑھا کر یہ کہتی ہے۔ اس سے مرکزی حکومت ہند سنبھل جائے گی اور پھر کوئی حکومت کے خلاف نفرت باقی نہ رہیگی تو بھی غلط ہے

انقلاب سے ڈرو درست یہ ہو گا۔ کہ ایسی اصلاحات لینے کے صرف ایک سال تک عوام کی انفرادی حالت موجودہ حالت سے بدرجہا زیادہ خراب ہو جائیگی جس کا حل نہ تو اس وقت کی حکومت کے پاس ہو گا اور نہ ہی آج کی حکومت اس ہونے

والی ابتر حالت کو روکنے کا سبب بن سکتی ہے اس سے مزدور و کاشتکار کا انقلاب بے پناہ مظالم لیئے ہوئے آئیگا۔ جس کو روکنے کیلیئے نہ تو سرمایہ دار کے پاس لالچ دینے کے لئے دولت ہے اور نہ ہی حکومت کے پاس طاقت۔ اس انقلاب کا اثر جب اکثریت پر جا کر انفرادیت پر ہوگا تو کوئی مسلم لیگ۔ ہندو لیگ یا کانگرس اُن کی بگڑی ہوئی اقتصادی حالتِ روزمرہ کو سنوار سکتی ہے۔ اس پر نہ تو کانگرس وزارتیں کنٹرول کر سکتی ہیں یا نہ ہی فرقہ دارانہ لیگیں صدارتیں، جس کی تصدیق کانگرس کی گذشتہ وزارتوں سے ہوتی ہے۔

جب قومی حکومت ۹ صوبوں میں تھی تو کیا مزدوروں اور کاشتکاروں پر گولیاں اور لاٹھیوں کی بارش بے موسم ہوتی رہی۔ نہیں ہر وقت ہوتی تھی۔ اگر ہندوستان کی پرجا کو کانگرس سے پیار ہوتا تو یقیناً اس چار سالہ عرصہ میں کسی صُوبہ میں بھی کوئی وزارت کسان مزدور پر کوئی تشدد نہ کرتی مگر ماضی اس امر کے خلاف شہادت دیتا ہے۔ اس لیئے مستقبل اس امر سے مانع ہے کہ تلخ تجربہ کی دوبارہ آزمایش حکومت کی عقلمندی اور سیاستدانی پر حرف پیدا کرتی ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ حکومت وقت اب کرے کیا؟

جب مرکزی حکومت غور کرتی ہے تو اُسے موجودہ فضا کو پُر امن رکھنے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔ حکومت خیال یہ کرتی ہے کہ اب پھر کانگرس سے پیار و محبت بڑھایا جائے اور گاندھی جی سے مفاہمت کر لی جائے۔ حکومت کو کانگرسی ہاتھوں سے اِسی طرح چلایا جائے تاکہ شہنشاہیت اور سرمایہ دار کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے۔ اِدھر سرمایہ پرست عنصر جو کانگرس کا مالک ہے۔ وہ بھی اس وقت اس خطرے کو لیکر

بیٹھا ہے کہ جلد حکومت کے خلاف کچھ گرم سرد بیانات جاری کر کے صلح کر لی جائے
قلمدانِ وزارت پر ہاتھ ڈال لیا جائے. مبادیات زمانہ اور حالات حاضرہ قدرے ڈراتے
ہیں۔ اس صورت میں حکومت اور پولیٹیکل طاقت پر سرمایہ دارانہ قبضہ ہو گا تو کسی حد
تک سرمایہ داری کی حفاظت کیلئے وسائل حکومت ضامن امن و امان ثابت ہونگے.
مگر دونوں مذکورہ فریق اس امر کو جانتے اور سمجھتے ہوئے ناآشنائی کا اظہار کرتے
ہیں کہ انفرادیت ہند بالکل آخری درجہ کی مجبور و مقہور ہستی بن چکی ہے۔ ہر شخص بلا محنت
روٹی نہیں کھا سکتا مگر حالات حاضرہ میں ہر ایک کو محنت اور جائے مشقت بھی حاصل
نہیں۔ یہی ایک بات ہے جو عوام کو خودبخود انقلابی طبع بناتی جا رہی ہے۔ اس سے
پہلے چونکہ سوشلزم کا پرچار پورے زور کا ہو چکا ہے۔ اس لئے بھی تمام عوام موجودہ
طرز حکومت کو ردی اور پرانا خیال کرتے ہوئے بدلنے کے قابل خیال کرتے ہیں۔
اس امر سے بالکل انکار نہیں ہو سکتا کہ جس قدر اور زیادہ عرصہ اس غریبی و بیکاری
اور جنگی دَور کے تأثرات کو موقعہ ملتا جائے گا۔ اسی قدر تیزی سے عوام غریبی ناداری
سے گھبراتے جائیں گے اور انقلاب کرنے کے زیادہ خواہشمند بنتے جائیں گے۔
اس فضا کو درست کرنے کا جو طریقہ حکومت نے خیال کر رکھا ہے کہ تمام انتہا
پسندوں کو زیر حراست کر لیا گیا ہے اور چند کو نظر بند کیا ہے. اس سے سوشلزم
کا پرچار نہیں رک سکتا۔ اس سے ان خیالات کی گرمی اور بڑھتی ہے اور ان خیالات
کے حامیوں کی قدر و منزلت بھی عوام کے دلوں میں زیادہ تر ہوتی جا رہی ہے۔
حالانکہ اشتراکیت کے حمائتیوں کی کوئی طاقت نہ تھی اور نہ ہی ان کی کوئی آواز
تھی۔ اس وقتی پالیسی نے خواہ مخواہ خود ان پر تشدد آمیز سلوک سے انکی ہمدردیاں

دردمند و مجبور عوام میں بڑھا دیتے ہیں۔

اب اگر کوئی سمجھوتہ حکومت کیلئے مفید ترین ثابت ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ حکومت مجبور عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی بیحد کوشش کرے۔ اس کا طریقہ ایک تو یہ ہے کہ ان اشتراکیت کے حامیوں سے مصالحت کر لے اور سب کو رہا کر دے۔ پھر تمام مجالس قانون سازمیں اقتصادی نیابت کے لحاظ سے نمائندگی حاصل کرنے کا اعلان شائع کر دے۔ جس سے ہر جماعت، ہر پیشہ کی نمایندگی حاصل ہونے سے حکومت کیساتھ صحیح جماعتوں کے تعلقات ہو جائیں گے جس کا نتیجہ حکومت کو امن و تسکین حاصل ہو گا۔

جس وقت ہر پیشہ میں حکومت کی فیاضی کا اثر ہوا کہ حکومت نے ہر جماعت کو حقوق تمدن و شہریت اور اقتصادی و سیاسی دے دئے ہیں تو یقیناً ہر فرقہ و ہر خیال کو محسوس ہو گا کہ حکومت نے اصلاحات دی ہیں جو ہر پیشہ و جماعت اپنی اپنی حسب ضرورت قانون بنانے اور بر خود حکومت کرنے کا حق حاصل کر چکی ہے۔ یہی ایک نقطہ ہے جو کہ سوشل ازم قائم کرنے کیلئے کہا جاتا ہے۔ اس سے ہندوستان کی سرمایہ داری کو پہنچنے والے نقصانات سے بھی حفاظت کی ضمانت مل جاتی ہے اور شہنشاہیت و حکومت کو بھی کسی مدت کیلئے سوچ و بچار کا موقعہ مل جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ انتہا پسند طبقہ اور مجبور عوام کی تسلّی کے لئے طرز حکومت کا انداز بدل جاتا ہے جس کا اثر ہر فرد کی روز مرہ زندگی و تمدن پر ہو گا۔

اس میں ایک سوال شاید کچھ الجھن سی پیدا کر دے کہ سرمایہ داروں کی حفاظت کیسے ہو گی۔ حکومت کا اقتدار کیسے قائم ہو گا۔

اس کا جواب یوں عرض ہے۔

جس کسی شہر یا آبادی کی باقاعدہ روزمرہ زندگی کو آپ قائم رکھنا چاہیں۔ اس کے لیئے صرف ۴۲ مندرجہ قسم آدمیوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اگر ان تمام پیشہ وروں کی مجلس قانون ساز (میونسپل کمیٹی یا صوبہ اسمبلی منتخبہ نمایندگی پر مشتمل ہو) تو بتائیے۔ اس میں کیا ہرج ہے جبکہ موجودہ دورِ حکومت میں فیکٹری مزدوروں اور ریلوے یونین مزدوروں کو چند نشستیں وقف کردی جاتی ہیں۔ اُس کے انتخاب میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی تو کیا وجہ ہے کہ ہر پیشہ کی اگر یونین اور جماعت کا انتخاب اُس کے راست حقداروں میں سے ہوگا تو صحیح ثابت نہ ہوگا۔ میرے خیال میں ایسے انتخاب کی موجودگی میں کسی قسم کی فرقہ دارانہ نیابت کا جھگڑا باقی نہیں رہتا۔ جس قدر حقوق مرکزی حکومت کو حاصل ہیں۔ اگر صرف اسی قدر اصلاحات کا بھی صحیح استعمال و تصرف اس انداز حکومت سے کیا جائے تو یقیناً اکثریت کیا تمام ملک میں امن و امان قائم رہ سکتا ہے بلکہ برطانوی سامراج کا عوام مشکور ہوگا۔

اب صرف مذکورہ سوال کا جوابی حصہ تھوڑا سا باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ سرمایہ دار اور مزدور کے مفاد کی باہمی ٹکر ہوتی ہے اس کا حل کیا ہوگا۔ غرض یہ ہی کہ ہر پیشہ ور چاہتا ہے کہ خود زیادہ فائدہ اٹھائے اور جو بھی اُسکے ساتھ ہیں۔ یا جو اس کے ساتھ لین دین کرتے ہیں اُن کو کم ملے۔

مگر یاد رہے کہ جب سب نمایندے ایک دوسرے کے مخالف ہیں تو یقیناً سرمایہ دار بھی اُن میں سے ایک مخالف ہے۔ جس وقت سب نمایندے مل کر اپنا معیار تمدن اور قانون بنائیں گے تو یقیناً ہر نمایندہ اپنی جماعت کے فائدے کو

مُقدم پیشِ نظر رکھے گا۔ اور دیگر اہم ممبروں کے حالات کا تقاضا بھی پہلو بہ پہلو اُس کے علم میں رہیگا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر حالت میں اُس کو اہم ووٹ کے معاملات کا لحاظ ضرور رکھنا پڑیگا جس سے وہ سب متفق ہو سکتے ہوں۔ یا اُس کی تجویز کو اکثریت پسند کریگی۔ ویسے ہی اہم حضرات اپنی طرف سے وہ بات جو کہ ان کے نقصان کی ہوگی۔ ضرور فایدہ سے بدلنے کی کوشش کریں گے۔ آخر وہ سب چُونکہ حکومت کو بر خود حکومت خیال کرتے ہونگے تو ضرور ایسے حالات اور شرائط پیدا کر لیا کریں گے جس سے ہر فریق دیگر فریقوں کی پوزیشن کو خوب سمجھ لیا کرے گا۔ تو یقیناً کوئی نہ کوئی قابل عمل قانون اور ہر دلعزیز سا راستہ نکال لیا کریں گے۔ جس سے اُس وقت کا نظام شہریت طرزِ حکومت پُرامن جاری رکھا جائیگا اسی طرح سرمایہ دار بھی ہر مزدور کے مُقابلہ میں اپنی طرف سے جو رعایت نظامِ وقت کو قائم رکھنے کے لئے دے سکتا ہوگا۔ دیتا رہیگا اور مزدور نمایندہ بھی جو رفتار زمانہ سے واجب حاصل کر سکیگا۔ لیتا رہیگا مگر اس صورت میں حکومت کا اعتبار کبھی بھی عوام میں خراب نہ ہوگا بلکہ عوام خود بخود رموزِ اقتصادیات سمجھنے اور امُورِ مملکت کو پُرسکون رکھنے کے خواہشمند بنتے جائیں گے۔ بدامنی پھیلنے کا امکان ہرگز ہرگز باقی نہ رہیگا۔ چُونکہ ہر مذہب کا آدمی تقریباً ہر پیشہ میں شامل ہے۔ اس لئے اس حالت میں مذہبی اور فرقہ دارانہ نیابت کا سوال بھی صاف اُڑ جائیگا نہ تو مسلم لیگ نہ ہندو سبھا اور نہ ہی کانگرس کی ضرورت رہیگی۔

کیونکہ ہندوستان میں مذہب کا وقار دفاتر سرکار میں کوئی سروکار نہیں رکھتا ہاں ہر مذہب کے لوگ سرکار کی ہر ملازمت اور پیشہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

جل پریوں کی رانی اور اُس کی کہانی

تاریخ وشعرائے قدیم کے کلام سے پتہ چلتا ہے کہ :-

ایران کی تہذیب وتمدن کا معیار نفاست ونزاکت پسندی رہا ہے جس کا اثر گذشتہ دور کے شاہان ہند نے بھی حاصل کیا۔

آج بھی متعدد عمارات جیتی جاگتی تصویریں ان کے جذبات کی ترجمانی کر رہی ہیں جس نقش کو دیکھو زبان حال سے ساری داستان کہے دیتا ہے۔

کشمیر کی آب وہوا ہر دل پر اپنا اثر رکھتی ہے۔ چشمہ ویری ناگ کو ایک نظر دیکھ کر قدرت کی انصاف پسندی تسلیم کرنی ہی پڑتی ہے کہ اس نے کس قدر انصاف سے ہر زمانہ کے انسانوں کو یکساں و قابلیت کا جوہر عطا فرمایا۔ اگرچہ یہ سائنس کا زمانہ ہے مگر گذشتہ زمانہ کی نقش نگاریاں بھی سائنس کی ایک منزل کا درجہ رکھتی ہیں۔ جن کو طے کرنے کے بعد آج سائنس نے یہ عروج حاصل کیا۔

چشمہ کا اصل چہرہ صرف ۲۰ فٹ چوڑا ہے۔ جس کے نیلگوں پانی کے گرد ایک فرش نہایت مضبوط اور نفیس انداز میں بنایا گیا ہے۔ اس پانی کے استقبال کے لئے پھر ۱۰ فٹ کا دوسرا حلقہ سنگ مرمر کا باندھا گیا ہے۔ اسی طرح پھر تیسرا دائرہ بنا ہے۔

پانی کا قدرتی رنگ آسمانی ہے اور چشمہ کی شکل سورج مکھی ہے۔ میں ابھی وہاں پہنچا ہی تھا کہ چند لمبے لمبے چولے پہنے کشمیری مولوی پنڈت آ گئے

مگر اُن کی محنت و مزدور کا نرخ یا تنخواہ مذہبی لحاظ سے تو انہیں حاصل نہیں ہوتا۔ ہر کس کی محنت کے لحاظ سے ملتا ہے۔ اس لئے حکومت کا سارا انظام محنت کے لینے اور قابلیت و عضانہ کے دینے پر چلتا ہے تو حقوق سیاست۔ تمدّن اور حکومت بھی کیوں نہ تقاضائے محنت، امتیاز لیاقت کے لحاظ سے منقسم ہو۔ جو کہ وقت کا صحیح تقاضا ہے۔ اسی سے ہر فرد پر چا اور حکومت کا ہر فریق خوش و خورم رہ سکتا ہے۔ اس لئے یہ ضرور حکومت کے ہر فریق کو مفید ہے ورنہ ہندوستان کا آئینی حل دوسرا غلط اور نا قابل عمل ثابت ہوگا ؛

جو چشمہ کی شان میں کچھ رٹتے ہوئے فقرے فارسی اردو میں کہتے اور اس کی تاریخی حیثیت سے تعارف کراتے۔ عوضانہ مانگتے اور بس۔

مَیں نے اُن سے بہت کچھ سُنا۔ مگر جو دل میں سوالات پیدا ہو رہے تھے۔ اُن کا جواب ملنے کی توقع نہ رکھتے ہوئے کشمکش کی حالت میں چشمہ کے کنارے بیٹھ گیا۔ پانی کی ٹھنڈک تازگی دینے لگی۔ بربطِ ہستی کے میٹھے سُروں کی طرح درختوں کی سائیں سائیں اور معطّر ہوا کے جھونکے وجدانی کیفیات پیدا کر رہے تھے اتنے میں ایک سبز رنگ کی مچھلی سینۂ آب کو چیرتی ہوئی میرے قریب آئی۔ اس کا جسم زمرّدیں، آنکھیں یاقوتی تھیں۔ پھول دار پر ایسے معلوم ہوتے تھے۔ جیسے ننھے منّے سے خوش رنگ تتریاں چمٹ رہی ہوں۔ اس کے ساحرانہ رقص اور رہوا کے تموج سے سطحِ آب پر ہلکے ہلکے نقش بنتے اور مٹ جاتے۔ مَیں اِس نظارہ میں کھو سا گیا تھا۔ ایک خفیف سی آواز آئی۔ "مَیں حضرت اکبر اور شہزادہ سلیم کی ملاقی ہوں"۔

مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے اپنے ہی کان بول رہے ہیں۔ آواز کچھ تیز ہو گئی۔ جل پریوں کی شہزادی نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا ابھی کل ہی کا ذکر ہے۔ شہزادہ سلیم آئے۔ تھکے ماندے چشمہ کے کنارے بیٹھے کچھ سوچ رہے تھے۔ ان کے ہمراہ ایک خوبرو لڑکی بھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی چلا کر بولی "آہا کیسی پیاری سی مچھلی ہے"۔ کچھ دیر ٹھٹک کر سلیم کی طرف مخاطب ہو کر بولی "کوئی اسے مار نہ دے"۔

مَیں نے کہا۔ مجھے کوئی کیوں مارے گا؟ مَیں تو زمین کی چھاتی سے آبِ شیریں

پیتی ہوں۔ کسی کا کچھ کھاتی نہیں۔ نہ ہی کسی کا کچھ بگاڑتی ہوں۔ مجھے کوئی کیوں مار دے گا۔ سلیم بولے تجھے تیری خوب صورتی کے باعث مارا جائے گا۔ ہوس کے پجاری اس قسم کی شکلوں کو جب دیکھ پائیں گے ضرور ماردیں گے اور تیری کھال اُتار کر کسی عجائب گھر کی زینت بنائیں گے۔ اس لئے آ تیرے لئے کوئی بہتری سوچیں۔

نورجہاں بولی۔ اس کا کیا کیا جائے۔ جس سے یہ خوب صورت پری قدرت کا دلفریب کارنامہ زمانہ کے سامنے زندہ رہ سکے اور اسے ضرر نہ پہنچا سکے۔

سلیم بولے۔ اچھا چلو۔ ابّا جی سے ذکر کریں گے۔ جو وہ کریں گے بہتر ہو گا۔

سیر کے بعد سلیم، اکبر کے حضور گئے۔ کیفیت کہہ دی۔ میں ابھی یہاں ہی تھی تو میں نے شاہ اکبر کو دُور سے آتے سنا۔ ہوا کی ہلکی ہلکی جنبش نے پانی کی موجوں کو پیغام دیا۔ کہ شاہ اکبر آ رہے ہیں۔ جوں جوں قدم مبارک نزدیک آ رہے تھے۔ توں توں ہوا کی لہریں بھاگ بھاگ کر خوشخبری دیتی ہیں۔ پانی کی لہریں ایک دوسرے کے گلے مل رہی تھیں میں بھی نظارہ کے لئے سینۂ آب پر تڑپ رہی تھی۔ فضا نے شادمانی کے نغمے گائے اور شاہ عالم پناہ تمکنت سے تشریف لائے۔ مجھ پر نظر پڑی صانع کی تعریف کی اور جذب دل سے دُعا کی کہ مجھے توفیق عطا فرما کہ میں ان رنگین نقوش کی حیات جاودانی کا باعث بھی ہو۔ پھر اکبر اعظم مجھ سے یوں گویا

ہوئے۔

"سلیم اور نور جہاں کا خیال ہے۔ تجھے حفاظت سے رکھا جائے"

میں نے عرض کیا۔ میری حفاظت کیلئے اور کون کرے گا؟ فرمایا"میں اور میرا شاہی وقار"۔

میں نے ادب سے عرض کیا۔ میری دلی خواہش ہے کہ میں آپکی حفاظت میں ہمیشہ ہمیشہ رہوں مگر بزرگ خضر کی اجازت لازمی ہے۔

میں بھاگی بھاگی حضرت کے دربار میں پہنچی۔ سب حال کہہ سنایا۔

وہ بولے"بیٹی! ایسا ہی ہونا چاہئے جیسا کہ وہ کہتے ہیں"۔

واپسی پر معلوم ہوا کہ اکبر اعظم نے مروارید اور یاقوت کا چونہ لگا کر چشمہ کا منہ بنوایا ہے۔ باقی عمارت سلیم اور نور جہاں نے تمام طاقت و خزینہ صرف کر کے پایۂ تکمیل تک پہنچائی ہے۔

میں ان کے وعدہ کی ایفا میں یہاں بیٹھی ہوں۔ میری دیکھا دیکھی اس قدر مچھلیاں یہاں جمع ہوگئی ہیں کہ خدا پناہ! کبھی کبھی تو پانی میں کمی ہونے کا احتمال ہو جاتا ہے مگر ان میں سے کوئی نہیں جاتی۔

یہ سب جانتی ہیں جو وعدہ اکبر اعظم اور جہانگیر مجھ سے کر گئے ہیں اس کی وجہ سے اکبر و جہانگیر اور نور جہاں میرے پاس آنے والے ہیں۔

یہ سب ننھی ننھی مچھلیاں ہر آنے والے کو دیکھ کر اس خیال سے بھاگ کر اوپر آجاتی ہیں کہ شاید ان میں سے کوئی اکبر اور جہانگیر نکلے تو دیکھنے میں کوئی ننھی پیچھے نہ رہ جائے۔

چنانچہ اس چشمہ کے مرکز سے جو پانی جہانگیر نے اس کی گلزار میں دو چھوٹی آبشاروں میں نکالا تھا۔ کئی دفعہ ان کے اندر جا جا کر بھی میری ننھیاں دیکھ بھال آتی ہیں۔ آج ہی مجھے پیغام ملا ہے کہ میرے پانی کی مچھلیاں دریائے جہلم تک ہو آئی ہیں۔ مگر جہانگیر اور اکبر کا کوئی درباری تک بھی نہیں ملا۔ چند عزیزوں کو میں نے پہلے بھی اپنے چشمہ کے پانی کے ہمراہ جہلم کے ذریعے سات سمندروں میں تلاش کرنے بھیجا کہ وہ جہانگیر و نورجہاں کو بلا لائیں تاکہ میں نے جو وعدہ کیا تھا۔ اس کا جواب دے سکوں اور کہوں کہ جل دیوتا نے آپ کی قربانی کے عوض جو آپ نے اس چشمہ کو بنانے میں کی ہے۔ فرمایا ہے۔ کہ ہم بھی اس شیریں آب کو اس وقت تک جاری رکھیں گے جب تک کہ کائنات میں زمین کا فرش قائم ہے یہ پیغام چاہتی ہیں۔ اکبر اعظم اور جہانگیر کو اپنی زبانی دوں مگر وہ مجھے نظر نہیں آتے۔

ہزاروں لوگ آتے ہیں۔ پھر ان میں وہ جوہر نہیں جو اکبر اور جہانگیر میں تھا۔ ہاں! آپ کو اگر ان کا کوئی پتہ چلے تو میرا پیغام ضرور پہنچا دیں۔

میں نے راتوں کو سونا چھوڑ دیا ہے۔ جب میرے دل کے نالوں کی گونج اس جنگل میں پڑتی ہے تو ہزاروں بن باشی اس چشمہ کے ارد گرد دوڑ کر جمع ہو جاتے ہیں۔ اس مغربی پہاڑی کی طرف دیکھو۔ کس قدر درخت میرے کناروں کی طرف اترتے ہوئے سبز پوش فوجوں کی طرح آ رہے ہیں اور وہ دیکھو۔ پہاڑوں کی بڑی بڑی چٹانیں میرے نعرۂ درد سے بیقرار ہو کر مجھے تسلی دینے بھاگی چلی آ رہی ہیں۔ دیکھنے والے گھبرا کر میری بات سننے بغیر

ہی بھاگ جاتے ہیں۔ درختوں نے بل ہل کر دشوار گذار جنگلوں کی شکل اختیار کر لی ہے اور چٹانیں گر گر کر آنے والوں کی راہ میں دیوار کی طرح حائل ہیں مگر میں ہوں کہ ان کا انتظار کئے جا رہی ہوں۔ ہر وقت اسی فکر میں ایک لمحہ کے لئے بھی غیر حاضر نہیں ہوتی کہ شاید میرے پیارے محسن میری ملاقات کو آئیں تو مجھے نہ پا کر رنجیدہ ہوں۔ اور میں بھی دیدار سے محروم رہ جاؤں

(ماخوذ از زخم)

مسولینی

مسولینی اٹلی کا موجودہ ڈکٹیٹر تھا۔ لوہار کا بیٹا تھا۔ اس کے دادا فوج میں لفٹننٹ تھے۔ والد سوشلسٹ خیال کے حامی تھے۔ والد محترم صرف ۵۰ سال جئے۔ انہوں نے ۱۶ سال سیاسیات میں صرف کئے۔ اور کئی بار اپنے خیالات کی خاطر جیل میں بھی گئے۔ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ کافی دیر سے قائم شدہ طاقت سرمایہ داری کو توڑنا آسان کام نہیں جدوجہد کرتے رہنے سے ہی کامیابی نصیب ہوگی۔ آپ محنت کش مزدور تھے۔ اُن کی رائے تھی "غریبوں کے گلے میں بوجھل پتھر کی طرح سرمایہ داری لٹک رہی ہے۔ صرف یہی پتھر ہے جو کہ ہر غریب کی ترقی میں حائل ہے"

غریب دوست۔ علم نواز۔ غریب کی ہمدردی میں ہر وقت تیار رہتے تھے

بچپن مسولینی بچپن سے والد کے تاثرات لیکر اُٹھے۔ والد کے ہمراہ دُکان میں خوب ہتھوڑا چلایا۔ روزگار کی قیمت میں اپنی محنت فروخت کرنے کا مزا چکھا۔ ہر گاہ غریبی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا مگر اُن کے والد محترم نے ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور بچہ کو ہر وقت یہی چاہا اور کہا کہ میں کوئی ایسی صورت اختیار کروں، جو یہ بچہ میری زندگی میں نہیں، تو میرے بعد ہی کسی طاقت کو حاصل کرلے۔ جس سے غریبوں کی ترقی کا باعث بنے

اور دُنیا میں ترقیٔ انسان کا سُورج بن کر چمکے ؛

مسولینی کا اصلی نام تاناشاہ تھا۔ یہ وارنوڈی کاسٹا گاؤں میں پیدا ہوا۔ یہ گاؤں ایک پہاڑی کی چھاتی پر واقع ہے ۔ فارلم پوپلی شہر میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ جنگ عظیم سے دو سال پہلے اخبار اونتی کے نمائندہ بن کر ایک کانگریس میں گئے۔ اس وقت آپ کی عمر ۲۷ سال تھی۔ یہ نہایت اعلےٰ اور مشہور ترین سوشلسٹ اخبار تھا ؛

مسولینی کا خاندان تیرھویں صدی میں ۱۲۰۰ء گاودلی مسولینی خاندان سے تعلق رکھتا ہے ۔ یہ دونوں خاندان بولونا پر حکمران تھے ۔ یہ اِٹلی میں رومانیا کے رہنے والے تھے ۔ اس علاقہ کے لوگ ہمیشہ جہاد کے حامی رہے ہیں۔ بہادری کو پیار کرتے اور جان بازی کو ہُنر مانتے تھے ۔ جو کوئی من چلا اُن کو از قسم بغاوت کے پروگرام کی ترغیب دیتا۔ فی الفور پل پڑتے اور مار و مار کرتے میدان میں کود پڑتے ۔ آپ نے کافی دُکھ برداشت کئے۔ لوگوں میں گھر گھر پھرے۔ کئی ساتھیوں کو کام کاج سے ہٹایا اپنے ہم خیال بنا کر صدق دِلی کی قسم دی۔ ساتھیوں کو پیار کیا۔ ہر ساتھی نے مسولینی کو پیارا جانا۔ دن بدن تیزی سے رفتار بڑھی۔ سیاسیات مُلک میں دسترس ہوئی۔ تو الیکشن لڑے۔ بڑے پیار سے کامیاب ہوئے مگر کئی بار ناکامی کے قدم بھی چومے ۔ آخر وقت آیا کہ آپ نے سوشلسٹ خیالات کو چھوڑا۔

حضرت نٹشے کا فلسفہ پڑھا۔ پھر بازار کی زندگی کو ایک کتاب

کہا۔ آپ نے فرمایا۔ جو انسان روزمرہ کے تجربہ سے کچھ سبق حاصل نہیں کرتا۔ اُس کے لئے تمام دُنیا کی کتب پڑھنے کے باوجود کوئی عالم بننا مشکل ہے ⁂

جب ٹریپالینا کی فتح ہوئی تو اُس میں بے شمار جانیں تلف ہوئیں بیحد مال ضائع ہوا۔ تو اُس سے اُس نے کافی موقعہ پایا۔ خوب اپنے خیالات کا پرچار کیا۔ اور قلم کی بجائے تلوار کو ہاتھ میں لیا۔

اس مرحلہ زندگی پر پہنچتے ہی ان کی بیوی راشیل کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جس نے اس کی زندگی میں ہر مصیبت میں ساتھ دیا۔ یہ بڑی صابر وفادار بیوی تھی۔ لے دے کر اسکے گھر امید کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی کرن ایڈا لڑکی تھی۔ یہ ننھی بچی نہایت ہونہار تھی۔ والدین کی کڑی مصیبت میں تسکین وسہارا کا کام دیتی تھی ⁂

نٹشے کی تعلیم "علم پڑھنے سے نہیں آتا بلکہ تجربات سے حاصل ہوتا ہے"۔ عوام کے مفاد کے نظریہ سے مُراد یہ ہے (میری زندگی میرے عیال میری اٹلی کی زندگی مُراد ہے)۔ رحم، انصاف، دیا، مساوات، اخوت، آزادی، حقوق انسانی وغیرہ صفات تو انسان کی ترقی کے لئے زہر قاتل ہیں کیونکہ انسان کی ترقی کے حق میں عیسائیت جیسے مذاہب کا وجود لعنت ہے۔ یہ تمام صفات عیسائیت کے ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ ورنہ آدرش یہ ہے کہ انسان اعلیٰ پیدا ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ جو لوگ نکمے اور بیکار پیدا ہو جائیں، ان کی

کانٹ چھانٹ کر دی جائے۔ مگر عیسائیت اور مذکورہ صفات کی موجودگی کی وجہ سے نکمے لوگوں کو زندہ رہنے کا موقعہ مِل جاتا ہے جو کہ اعلےٰ قسم کے انسانوں کی سوسائیٹی کے لئے بوجھ کا کام دیتے ہیں اور یہی ترقی انسان کو رد کرنے کا سبب بن جاتے ہیں ؛

انسان جب اشرف المخلوقات پیدا ہوتا ہے تو ضروری ہے کہ فوق البشر بھی ثابت ہو۔ اگر وُہ اپنے انسان ہونے کے علاوہ اعلےٰ جنس اپنے عمل سے پیدا نہیں کر سکتا تو اُسے موت کو ترجیح دینا چاہیئے۔ گویا موت سے مِل کر خود کو اعلےٰ جنس بنانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اِس فلسفہ پر مَیں ایک الگ مضمون لِکھ رہا ہُوں۔ سر دست مسولینی کی سوانح پر مضمُون لکھنے کیلئے اسی پر اکتفا کیجئے ؛

جب مسولینی نے نٹشے کا فلسفہ پڑھا تو اُس نے اپنی زندگی کا نظریہ پھیر بدلا۔ اور اس کے ساتھیوں کو اس کی صدق دلی پر پُورا اعتماد تھا۔ انہوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

اُس نے جمہوریت کا خاتمہ کر کے ڈکٹیٹری کو اپنایا۔ اُس نے اپنی سوانح میں لکھا ہے کہ جمہوریت نے ہماری ملکی حیثیت کو خراب کر رکھا تھا ہزاروں پارٹیاں بن بن کر لوگ سیاسی اکھاڑے میں اترتے تھے بس مُلکی قبضہ کو برقرار رکھنے پر بھی ہزاروں قسم کی جدوجہد ہوتی رہتی تھی۔ مُلکی ترقی اور انسانی بہتری کے لئے ہم ہرگز ہرگز نہ سوچ سکتے تھے۔ ہر الیکشن سے پیشتر یہی دَور رہتا تھا۔ شاید اگلے الیکشن میں ہم کامیاب ہوں یا نہ۔

کئی برائیاں صرف الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے کی خاطر ہم کر گذرتے تھے۔ جن کا نتیجہ آخر مُلکی ترقی کے لئے نقصان رساں ثابت ہوتا تھا۔ میری آمریت کے دور نے میرے مُلک کو پھر سے زندہ کر دکھایا میرے ساتھیوں نے جب سوشل، سیاسی مُلکی ترقی ہوتے دیکھی، تو مجھے اور اُکسایا۔ مَیں نے تیز قدمی سے کام لیا۔ آج میرے لئے میرا مُلک ہر طرح کی قربانی کرتا ہے۔ مَیں یہ اعلان کرتا ہوں کہ عوام کی زندگی میری زندگی، عوام کی بہتری میری بہتری میرے عیال کی بہتری ہے۔

"میرا نظریہ فسطائیت ہے"

جس کو مَیں نے نٹشے کے فلسفہ سے حاصل کیا ہے۔ جسکا بنیادی اصُول ہمیشہ کام کرنا ہے اور حُکم ماننا اور حُکم منوانا ہے۔ میری پارٹی کا پہلا جنرل سیکرٹری فاری ناکی تھا۔

مَیں نے فاسٹیٹ پارٹی قائم کی جس میں لاکھوں ممبر شامل ہیں۔ مَیں اُن سب کو نامزد کرتا ہُوں کیونکہ مجھ پر سب کو اعتماد ہے اور سب پر مجھے اعتماد حاصل ہے۔ اِس لئے جو حکم دیتا ہوں۔ سب اُسکو مانتے ہیں

ذاتی صفات

مجھے دوستی دلیل سے حاصل نہیں۔ مَیں تو اپنے احساسات سے پرکھتا ہُوں۔ اگر میرے احساسات مجھے کسی کے نزدیک پیارا دوست محسوس کراتے ہیں تو اُسے دوست سمجھتا ہُوں۔ ورنہ دلائل حاصل کر کے اپنے آپکو دوست ثابت نہیں کرتا۔

جمہوریت کے دور میں میرے ملک میں یکم مئی کا تہوار منایا جاتا ہے مگر جب سے مَیں نے فسطائیت اور آمریت میں قدم رکھا ہے۔ مَیں نے اکیس اپریل کا دن جشن روما کیلئے وقف کردیا ہے۔ روما میرا قدیمی دارالخلافہ ہے۔ اِس شہر میں بہترین انقلابات آئے۔ وہ سب انقلابات اِس کی شاندار ہستی کے دامن کی گرد ثابت ہوئے۔ یہ روما اصلی حیثیت میں قائم رہا۔ آج دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ اِس لئے مجھے اس کی شان کا ادب منظور تھا۔ مَیں نے اکیس اپریل جو کہ روما کی پیدائش کا دن تھا۔ روزِ جشن مقرر کردیا۔

تبصرہ

اِٹلی نے پچھلے سالوں میں جنرل فرانکو کو امداد دی اور حبشہ پر حملہ آور ہوا۔ اُس کے ملک کو ضبط کرلیا۔ اسکی رائے ہے۔ جس قدر شاندار روم کی فتوحات سابقہ زمانہ میں تھیں۔ وہ مقبوضات پھر سے حاصل کروں گا۔

اس کے علاوہ اس نے ہر ہٹلر سے مِل کر تمام دُنیا کی سیاسیات میں تلاطم پیدا کرکے دکھایا۔ سیاسیات کے میدان میں کئی تبدیلیاں رونما ہوگئیں۔ کبھی شہنشاہیت کا ساتھی بنا، تو کبھی جمہوریت و اشتراکیت کا حامی۔ مگر خود میاں آمریت و فسطائیت پر ہی ڈٹے رہے ہیں۔ موجودہ جنگ سے پہلے تو بڑی ڈراؤنی طاقت تسلیم ہوتے تھے مگر مفکرین کی رائے کو تجربے نے غلط ثابت کردکھایا؞

چند ماہ گذرے۔ آپ کو یونان سے لڑنا پڑا۔ عرصہ چار ماہ میں آپ اُس طاقت کو ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹا سکے۔ اس کے برخلاف حکومت برطانیہ نے قدرے یونان کی حوصلہ افزائی کی۔ جس کے جواب میں ہر ہٹلر نے شدید حملے شروع کئے۔ آخر یونان کو شکست ہوئی اور اِٹلی کی شان اور سب شیخی کرکری ہوگئی۔ مگر بیانات سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ آپ اِس وقت تک بھی آمریت و فسطایت کے دِلدادہ ہیں ÷

آپ کو فسطایت کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ آپ نے اِٹلی میں اسکو شروع کیا اور آج اس کو کمال پر پہنچایا ہے۔ اس پر بھی الگ مضمون درج ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

نٹشے کا زور اور اسکا فلسفہ

رشیا میں جو جرمنی کا سب سے بڑا ملک ہے۔ جس کے بادشاہ گذشتہ جنگ عظیم تک قیصر جرمنی کہلاتے تھے۔ اُس کے ایک صوبے کا نام ڈاکسن (sachsen) یا (sosen vy) ہے۔ اِس میں لوتسن نامی شہر ہے ÷

اس کے قرب میں ایک قصبہ روے کن ہے۔ اس قصبہ میں ۱۵۔ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو یہ نامور فلسفی پیدا ہُوا۔ آپ کے والد اِس قصبے کے پادری تھے۔ تقریبًا تین سال بعد اس کی بہن الزبتھ ہُوئی۔ ہونہار بیٹے کی عمر ابھی پانچ برس بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ۲۸ جولائی ۱۸۴۹ء کو آنجناب کے باپ انتقال فرما گئے۔ والد بزرگ صرف ۳۶ سال کی عمر کے ہُوئے۔ اُن کی وفات کے بعد جلدی ہی اُن کی والدہ محترمہ اپنے دو

بچوں کو لے کر اپنی سسرال میں چلی گئی۔ چونکہ یہاں بھی خاندان پروٹسٹنٹ پادریوں کا ملا۔ لہٰذا ہمارے نٹشے کی تعلیم و تربیت عیسائیت اور کلیسائیت کے ماحول میں ہوئی اس نقطہ کو یہاں خوب ذہن نشین کر لینا چاہیئے کیونکہ آگے چل کر ہمارا فلسفی اِن کے خلاف ہو جاتا ہے۔ نیز اپنی تمام تصانیف میں اُن کی مخالفت کرتا ہے

جس طرح ہمارے یہاں سرکاری اور غیر سرکاری مدارس ہیں اُسی طرح جرمنی میں بھی تعلیمگاہیں تین حصّوں میں منقسم ہیں۔

اوّل۔ ابتدائی تعلیمگاہیں جو میٹرک تک ہیں۔ جنہیں فولکس شولے کہتے ہیں۔

دوئم۔ وسطی تعلیمگاہیں جو ایف اے اور بی اے ہیں جنہیں گمنازیئم کہتے ہیں؛

سوئم۔ اِنتہائی تعلیمگاہیں جو یونیورسٹی کہلاتی ہیں؛

اِسی طرح آپ نے ابتدائی تعلیم فاومبرگ کے ایک غیر سرکاری مدرسہ میں حاصل کی۔ پھر دس سال کی عمر میں نٹشے شول پفورتا کے گمنازیئم میں داخل ہُوا جو فاومبرگ سے ۳ میل پر واقع تھا ۱۸۶۴ء تک وہیں پڑھتا رہا۔ بچپن سے ہی نٹشے بہت خوش طبع واقع ہُوا تھا. قواعد و احکام کی پابندی خوب کرتا۔ اِسی خاموش طبعی کے باعث وہ اپنے حلقہ احباب میں چھوٹے پادری کے نام سے مشہور تھا؛

ایک بار آپکی ماں نے اُنھیں خاموش و سنجیدہ ہونے کا الزام لگایا ۔ تو جواب دیا کہ سکول کے قواعد میں لکھا ہے کہ سکول چھوڑتے وقت لڑکوں کو اُچھلنا کودنا نہ چاہیئے بلکہ سکون اور آہستگی کے ساتھ گھر پہنچ جانا چاہیئے اس پر مذہبی ماحول کے تأثرات اسقدر بڑھ گئے تھے کہ ہر وقت مذہبی راگ اور انجیل کی آیتیں نہایت دردناک انداز میں گاتا رہتا تھا ۔

اسے سچ بولنے کی عادت تھی کیونکہ یہ عادت اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی تھی ۔ اسکی خاص وجہ یہ تھی کہ اسکے آباؤ اجداد خاندانی شریف تھے ۔ زمانہ تھا کہ پولینڈ کے نوابوں میں شمار ہوتے تھے ۔ اٹھارھویں صدی کے اخیر میں پروٹسٹنٹ ہونے کی وجہ سے پولینڈ سے بھاگ کر جرمنی میں پناہگزین ہوئے تھے ۔ اسکو اسکی بہن الزبتھ ہمیشہ کہا کرتی تھی ۔ جھوٹ بولنا ہم نواب زادگان کی شایان شان نہیں نطشے شروع سے ہی اپنی بہن سے خوب پیار کرتا تھا ۔ اُسکی تعلیم میں ہر طرح حصہ لیتا تھا ۔

وہ بالخصوص خودداری کی تعلیم پر بہت زور دیتا تھا ۔ اس کا مقولہ تھا کہ روحانی اور جسمانی تکالیف اور ظلم کو ہنسی خوشی برداشت کرنا چاہیئے ۔ وہ اپنی بہن لاما سے اکثر کہتا تھا ۔ جو شخص اپنے نفس پر قابو پا گیا ۔ وہ دوسروں پر بھی حکومت کر سکتا ہے ۔ اُس نے پیار کا نام بہن کو لاما دے رکھا تھا اور بڑے ہو جانے پر بھی وہ اکثر اُسے اسی نام سے پکارتا رہا ۔

دراصل یہ لفظ اس طرح اُس کی نگاہ میں آیا۔ وہ کسی اِبتدائی کتاب میں حیوانات کا ذکر پڑھ رہا تھا۔ لاما کا ذکر آیا۔ لاما عجیب و غریب جانور ہوتا ہے جو بخوشی بھاری سے بھاری بوجھ اُٹھاتا ہے۔ اگر کوئی اس پر ظلم کرے تو وُہ کھانے پینے سے انکار کر دیتا ہے اور مرنے کی خاطر زمین پر لیٹ جاتا ہے اور مر جاتا ہے۔

اُس کی قوتِ متخیلہ اس قدر تیز تھی کہ بچپن میں ہی طرح طرح کے کھلونے ایجاد کیا کرتا تھا۔ اور اس کے ابتدائی اشعار سے بھی اس امر کا ثبوت ملتا تھا۔ وُہ شاعر تھا اور اُسے پیانو بجانے کا شوق تھا۔ اُس نے ساز بجانے میں کافی مہارت حاصل کر لی تھی۔

دوستی کا بے حد پاس رکھتا تھا۔ اُس نے مرتے دم تک اپنے دوستوں کی دوستی کو نبھایا۔

اس نے ۱۸۶۰ء میں اپنے دو ہم جماعتوں کے ساتھ ملکر ایک ادبی مجلس کی بنیاد رکھی۔ جس کا نام گرمانیا تھا۔ اُس میں راگ کی بیحد حمایت کی گئی اور ایک موسیقی رسالہ بھی منگایا کرتے تھے۔

جب ۱۸۶۴ء میں یونیورسٹی میں داخل ہوا تو اسکی توجہ لاطینی دیونانی پڑھنے کی طرف زیادہ ہو گئی۔ اس وقت آپ مذہبیت سے آزاد نہ ہوئے تھے۔ اِس لئے اُس نے اپنا نام دینیات میں لکھوایا۔ اس پر اس کے استاد رتسئل کا بہت گہرا اثر پڑا۔

پھر اُس نے دہریت کے فلسفی شوپن ہاؤر کی کتب کا مطالعہ شروع

کیا۔ دورانِ تعلیم میں ہی اس کا دِل مذہبیت سے برگشتہ ہو چکا تھا اور رہی سہی کسر اس شوپن ہاوٹر کے مطالعۂ کتب نے دل و دماغ سے نکال دی ؛

۱۸۶۷ء میں آپ نے اپنے روزنامچہ میں تحریر فرمایا ہے کہ آپ نے ایک خط اپنے دوست روڈے کو لکھا جس میں تعلیم و مذہب سے نفرت کا اظہار کیا ؛

رتشل نے اپنے شاگرد نٹشے کے متعلق اپنی کتاب میں لکھا ہے "نٹشے ایک شاندار انسان ہے اور کسی دن دُنیا کی مایۂ ناز شخصیت بنے گا"

نٹشے نے ایک سال فوجی خدمات بھی سرانجام دیں۔ ایک روز کود کر گھوڑے پر چڑھنے لگے سینہ زخمی ہو گیا۔ پھر سپاہ گری سے بھی مُنہ موڑ لیا۔

آخر وقت آیا۔ آپ نے تعلیم مکمل کر لی۔ پروفیسر فشر نے نٹشے کو بازل یونیورسٹی میں ۱۸۶۷ء میں پروفیسر بنا دیا۔ اُس وقت آپ کی عمر صرف ۲۴ سال تھی۔ بازل یونیورسٹی آپکو مرتے دم تک تین ہزار فرانک سالانہ ادا کرتی رہی ؛

اس یونیورسٹی میں پروفیسر دینیات Traney over break نے اپنے اقوال میں لکھا ہے کہ عیسائیت کو تمدّن و تہذیب سے تطبیق دینا غلطی ہے۔ اس پروفیسر کی صحبت نے بھی قدرے نٹشے کو متاثر کیا

۱۸۷۰ء کی جنگ نے نٹشے کی طبیعت پر عجب انقلابی اثر پیدا کیا اُس نے ہزاروں انسانوں کو موت کا لقمہ بنتے دیکھا۔ لاکھوں محلات خانماں برباد ہوتے دیکھے۔ مگر عیسائیت کا فلسفہ کسی مظلوم کو ڈیا، رحم کے ہتھیار سے بچا نہ سکا۔ اِس منظر نے ہمارے فلسفی کو تخیّلات کی گہرائیوں میں اُتارا۔ اور بلندیوں میں اُڑایا۔ آخر سمجھ اور احساسات نے ایک نئے شاہراہ کی نمود بتائی۔ عیسائیت اور دینیات کو اُس نے ٹوں لیا ہے۔ کہ

"جُوں جُوں مذہب برباد ہوگا۔ انسان برتر ہوتا چلا جائے گا۔"

فلسفہ! اولیں اس رائے کہ ماورائے عالمِ ادراک کوئی سبب مطلق ہے۔ اپنی زندگی کے دورِ اول کے بعد وُہ اس مسئلہ کا قائل نہ رہا۔ پھر یہ خیال ہوگیا کہ دُنیا میں انسان کی زندگی کی تین منازل ہیں:۔ عالمِ تجربہ۔ عالمِ مظہرات اور عالمِ تصوّر، کوئی چوتھی چیز نہیں اِسلئے جو لوگ مذہب عیسائی۔ الوہیّت۔ حیاتِ ابدی اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ وُہ خام خیالی کا شکار ہیں۔ اِس قسم کی کسی دُنیا کا موجودہ دُنیا سے کوئی عالمِ تجربہ۔ عالمِ مظہرات اور عالمِ تصوّر میں بھی مدلل واسطہ نہیں رکھتا۔ صرف توہم پرستی کا نام الوہیّت۔ حیاتِ ابدی ہے، اُنہوں نے اپنے مشاہدات کو زورِ قلم سے ثابت کر دکھایا کہ صاحبِ علم محض ترقی یافتہ صاحبِ فن کا دوسرا نام ہے:

پھر ایک جگہ اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں اعتقادات علم مذہبی،

عالم ادراک ہی کے تصورات کا مجسمہ ہیں اور یہی دنیاوی زندگی کو زہر آلود کر دیتے ہیں۔

پھر فرمایا ہے کہ ہمارے ضمیر پر اس کا اثر ہے۔ تو اعتقاد حاصل ہے لیکن یہ مشکل ہے کہ ہر آدمی اپنے لئے کوئی نیا راستہ نہ نکال لے۔ یہی وجہ ہے۔ اعتقادات کی استقامت ہر مذہب کے سلسلے میں ہمیشہ پختہ خیالی میں نہیں رہتی۔ کوئی نہ کوئی جگہ آتی ہے کہ بڑے سے بڑے پرہیزگار بھی اپنے نفس کو آزاد کر کے دُنیوی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ورنہ بقولِ زردشت تو انسان فوق البشر ہے۔

اِس کتاب میں آپ نے واضح کیا ہے کہ اخلاقیات سے انسان کو ڈرا کر ترقی کی بجائے تنزّل دیا ہے۔ اخلاقیات کی پابندی کرتے کرتے نسلِ انساں میں اطاعت کا جذبہ پیدا ہُوا۔ ادب و تعظیم اخلاق نے سکھلائے۔ انسان کی فطرت نے پابندی و فرمانبرداری قبول کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ انسان کی ذہنیت غلامانہ بنا ڈالی ہے۔ چہ جائیکہ انسان سب سے آزاد اور اعلیٰ ہو اور خود کو مخدوم و فوق البشر ثابت کرے۔ اُلٹا مذہبیت نے اُسے خادم، مؤدّب اور روحانیات کا حامی بنا کر اس کی ہستی کو پستی پسند بنا دیا۔ ڈاکٹر ڈاروِن کی تھیوری میں انسان کی پیدائش کو تمام مخلوقات سے بہترین اور انتہائی عروج کی اعلیٰ پیداوار تسلیم کیا گیا ہے۔ انسان کی ابتدائی شکل گوشت کا لمبا سا ٹکڑا پانی کی تہ میں پڑا تھا۔ پھر کئی سال اسی صورت میں رہا۔ پھر اس کی شکل مچھلی کی

بنی - کچھ صدیاں یوں ہی رہا۔ ازاں بعد وہ گائے بھینس، سمندری گھوڑا بنا یسمندری جانوروں کی شکلوں میں ماحول نے ڈھالا۔ ایک وقت مشاطۂ قدرت نے اُسے خوب صورت جانور، چرند، پرند کی صورت میں رکھا۔ پھر بن مانس بنے اور لنگور و بندر انسان کی پہلی شکل کے چربہ ہیں۔ صانع فطرت نے کمال حوادث کا نتیجہ انسان پیدا کیا ہے جسے ڈاکٹر موصوف بہترین پیدائش کہتے ہیں۔ مگر نطشے نے ڈاکٹر ڈاروِن کی تھیوری میں بھی ترمیم پیش کی ہے کہ انسان کو اپنے سے بڑھکر ایک اعلیٰ جنس پیدا کرنی چاہیئے۔ حتیٰ کہ نسل انسان اپنے محل و اختیار سے اعلیٰ ترین ثابت ہو جائے۔

نطشے عوام الناس کی حیثیت و اہمیت کو تین صورتوں میں شمار کرتا ہے:

(۱) کہ عوام بڑے بڑے شخصیتوں کی مٹی ہوئی تصویریں ہیں۔

(۲) عوام اعلیٰ قسم کے لوگوں کی رنگین تصویروں کو بوسیدہ تختہ ہائے زمانہ سے خراب کاغذ پر اُتاری گئی ہیں۔

(۳) بڑے لوگوں کے پاس اسلحہ اور سامانِ حرب تھا۔ جو اِن کی قسم کو نکما خیال کرتے تھے۔ جنگ کرتے اور ختم کر دیتے تھے۔ مگر اب تو حضرت شیطان کے پاس مردم شماری کا رجسٹر ہر دم موجود رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی انسان عوام الناس کی صحیح گنتی نہیں رکھ سکتا۔

شوپن ہاؤر دنیا کے سب سے اعلیٰ ترین فلاسفروں میں سے تھا۔ وہ

دہریہ تھا مگر اس نے عیسائیت سے اخلاقیات کو الگ کر کے دہریت سے ملا دیا۔ اس کا دل عیسائیت میں رہا۔ دماغ دہریت کا حامی۔ اس کی رائے تھی کہ اخلاق ہر زمانے اور ہر مقام میں یکساں رہتے ہیں۔

شوپن ہاؤر نے یہ کوئی نئی بات پیدا نہیں کی جس کو تہذیب و اخلاق کی تاریخ میں نسل انسانی کے لئے مفید ترین فلسفہ تسلیم کیا جائے مگر نٹشے نے کہا کہ انسان کے مستقبل کی بلند ترین قیمت دہریت بنائیگی۔ اور مزید یہ بھی لکھا ہے۔ نٹشے نے قوت محرکہ کو اسقدر اہمیت دی ہے کہ دماغی علمی فلسفے کو دوسرے درجہ پر رکھ دیا ہے۔

فلسفی کون ہے؟

فلسفہ کوئی علم محض نہیں ہے۔ فلسفہ کا معاملہ گو دماغی ہے مگر اس کا تعلق بہادرانہ جذبات سے ہے۔

فلسفی وُہ آدمی نہیں۔ جو دیکھتا اور غور کرتا ہے۔ قاعدے و قانون اختراع کرتا ہے۔ بلکہ اس کا کام فرد قوم کے ہر شعبے میں قانون سازی و فرماں روائی کرنا ہے جو کہ ہر طرح بہترین اور قابل عمل ثابت ہوں یہی نٹشے کا ذاتی عقیدہ ہے :-

جمہوریت۔ اشتراکیت اور نٹشے

اشتراکیت کا نظریہ ہے کہ انسان کو نرم سے نرم تر بستر پر سلایا جائے اشتراکیت محض زندگی کے لئے سامان عیش و آرام مہیّا کرنے کے لئے عمل میں لائی گئی ہے :-

نٹشے کا خیال ہے کہ انسان کو آسانیاں، آرام زندگی کا مقصد نہ بنانا چاہیئے کیونکہ آرام و آسان پسندیاں تو آدمی میں نااہلیت پیدا کرتی ہیں۔ اِنسان کی انتہائی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وُہ ہر وقت جفاکشی، محنت اور خطروں میں رہے۔ تاکہ نسل انسانی کو کسی بہترین منزل پر پہنچا سکے۔ ورنہ بندر، مچھلی آرام کرنے میں سب سے اچھے کاریگر ہیں۔ اِس لئے وُہ جانور انسان سے بالاتر ثابت ہوں گے۔ مگر نٹشے لکھتے ہیں:۔ انسان کی شایانِ شان نہیں جو آرام و عیش کو ہی نظریہ زندگی تسلیم کرلے۔ انسان سے بہتر کوئی جنم نہ ہوگا۔ اِس لئے اس کو بہترین کوشش کر کے خود کو اعلٰے جنس ثابت کرنا چاہیئے۔ پھر نٹشے عیسائیت و مذہب پر یُوں سوال کرتے ہیں کہ انسانی زندگی کا نظریہ کیا عیش و آرام کی زندگی حاصل کرنا ہے؟ تو انسان کی نجات و آخرت کیا بلا ہے؟ اُس کا مزا اِنسان کے جنم کو حاصل نہیں ہوگا تو نجات و آخرت کیلئے کیا قربانی کرنے کی ضرورت ہے؟ کیا انسان کی منزلِ مقصود صِرف نجات و آخرت ہی ہے؟ تو پھر دنیا میں جینے کیوں آتا ہے؟ ہزاروں مصلحین پہاڑوں پہ کھڑے ہو ہو کر وعظ کرتے رہے۔ بڑی بڑی قربانیاں کر کے اپنی آواز کی قدر و منزلت کراتے رہے مگر اُن کی موت کے بعد مذہب کا راستہ پھر گمراہی گناہ کاری سے بدل جاتا رہا۔ آخر کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو سکی جس نے تمام دُنیا اُن کی ہمخیال بن سکے۔ ہاں صِرف واحد راستہ جو باقی ہے۔ وُہ یہ ہے کہ ہر انسان خود کو اعلٰے بنانے کیلئے

ہر وقت کوشاں رہے - اپنے اندر ایک جذبہ بجلی پیدا کرلے - جبتک اعلیٰ جنس بنکر ثابت نہ ہو گا - تب تک جینا محال ہے - یہ بجلی کی کوند تم کو جنگ و موت سے پیار سکھلائیگی - ترقی - عروج اور فتح و کمال تمام پاؤں صاف کرنے والے خادم بن کر رہینگے -

جنگ اقوام کے جذبات کو متحرک کر سکتی ہے - محض جنگ ہی ایک ذریعہ ہے جو انسانوں کو اعلیٰ و ادنیٰ سے تمیز کرائے گی - سامانِ جنگ بہتر سے بہترین پیدا کرنا چاہیئے جس کی اقسام میں ہوا - آگ - پانی - سردی وغیرہ پر انسان کو قابض بن کر تمام عالم جنسیات پر فوقیت حاصل کرنی چاہیئے زمین و آسمان ستارے آفتاب الغرض ہر طاقت پر انسانی قبضہ تسلیم کروانا چاہیئے - الغرض یہ تمام اوصاف انسانی نسل میں پیدا کیئے جائیں گے اور محض جنگ اور صِرف جنگ سے ہی حاصل ہوں گے - یہ قابل غور بات ہے - صِرف جنگ موجودہ سامان سے ارفع و اعلیٰ ہونا چاہیئے - اس پر بے شمار تجویزیں قوتِ متخیلہ پیش کرتی ہے - کئی کتب میں اور زردشت از نطشے میں بھی درج کی گئی ہیں -

اشتراکیت خیالات میں عورت کی ترقی اور اُسکی آزادی سے سوسائٹی اور نسل انسانی کی ترقی مُراد لی گئی ہے - اشتراکیوں کا خیال ہے کہ عورت کی آزادی سے نسل انسانی میں کافی ترقی ہو جانے کا امکان ہے مگر نطشے نے اپنی رائے کو یوں ظاہر کیا ہے کہ عورت کی آزادی اور اُس کو دیگر ترقی دینے سے مرد کی ترقی ہونے کی امید رکھنا عبث ہے ؛

بلکہ انسان کی شایان شان نہیں کہ صنف نازک کی ترقی کی جائے۔ صنف اسفل کو تنزل کے گڑھے میں ڈالے رکھا جائے۔ اس کی کاٹ چھانٹ یا ترقی و بہتری کا علاج عورت کی ترقی سے نہیں ہو سکتا۔ اس لئے یہ دلیل اور عمل خبط الحواس ہے ؂

جمہوریت۔ نٹشے

جمہوری نظام کو وقت ضائع کرنے والا اور بے کار و بے اختیار نظام خیال کرتے ہیں۔ اُن کی رائے ہے کہ عقلمند ہر جا عقلمند انسان ہوتا ہے۔ یہ کوئی ضروری امر نہیں کہ دس بیوقوف مل بیٹھنے سے ایک عقلمند پیدا ہو جائے اور نہ ہی دس عقلمندوں کے مقابلہ میں ۱۰۰ بیوقوف زیادہ سمجھدار ہو سکتے ہیں اس لئے جمہوری نظام میں اگر کوئی بات بیوقوفی کی یا خلاف نظام ہو رہی ہو تو ہزاروں دقتیں برداشت کرنے کے بعد اُس کمزوری کو قابو کیا جا سکتا ہے۔ کئی نقائصِ نظام ہوتے ہیں جن کو مُفکّرین دیکھتے ہیں مگر کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ جمہوری قانون کے ماتحت ہر ایک کو مساوی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس نظام کو ناقابل عمل خیال کرتے ہیں ؂

مولانا ابو الکلام آزاد

جناب آزاد حجاز کے ایک ممتاز خاندان سے متعلق ہیں۔ آپ کے والد بزرگ مولانا خیر الدین عرصہ دراز سے ہندوستان بلکہ خاص دہلی میں مقیم تھے اس لئے اسکا آبائی وطن دہلی کہلاتا ہے۔

آپکی پیدائش شہر مکہ میں ہوئی۔ آپ کے والد فقیر منش واقع ہوئے تھے۔ آپ دُنیوی ضروریات میں اسقدر بے نیازی سے کام لیتے تھے کہ کسی کے محتاج نہ تھے۔ جب سلطنت مُغلیہ کا چراغ سحری اپنے آخری لمحات گِن رہا تھا۔ اور مُلک بھر میں شورشیں بغاوت اور لُوٹ مار جاری تھے اور انتظام ملکی بہادر شاہ کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ ہر بڑا چھوٹا رئیس خود مختاری حاصل کئے بیٹھا تھا ہر طرف ہما ہمی کا دَور دَورہ تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا وقار لمحہ بہ لمحہ ترقی کر رہا تھا۔ اس چلا چلی کے نقشہ میں قریب قریب ہر متنفس بے چین نظر آتا تھا مگر کچھ ڈھارس بندھی ہوئی تھی کہ ابھی خاندانِ مغلیہ کی ٹمٹماتی ہوئی شمع باقی ہے چونکہ اس دور نگے دور میں مولانا خیر الدین موجود تھے کہ اچانک ۱۸۵۷ء کا غدر رُونما ہُوا۔ اور ایسے قیامت خیز مناظر نگاہوں نے دیکھے کہ الامان والحفیظ۔

ہر طرف قتل و غارت شروع ہو گئی۔ شیر خوار بچے فوجی سپاہیوں کی گولیوں کا نشانہ بننے لگے۔ بیکس عورتیں بے حرمتی اور ذِلّت کا شکار ہوئیں

بوڑھے اور ضعیف بزرگ ٹھوکروں میں روندے گئے۔ ہزاروں جوانوں کو تلوار کی گھاٹ اتارا گیا۔ لاکھوں گرفتار کرکے درختوں سے پھانسی دیئے گئے۔ مقتدر اور معزز ہستیاں چن چن کر ختم کی گئیں۔ اس نفسا نفسی کی عالم میں بے شمار قابل اصحاب کو موردِ ظلم بنایا گیا۔ اس وقت کوئی صاحب دل اور ملک و ملت کا درد رکھنے والا انسان یہ کبھی گوارا نہیں کرسکتا تھا کہ اس کی آواز اور آزاد ضمیر کو جبراً یا کسی مادی لالچ کی بنا پر خرید کر غلط طور پر استعمال کیا جائے۔ لہذا اس کا علاج صرف یہی تھا کہ جان عزیز کو لیکر یہاں سے ہجرت کر جائے۔ چنانچہ مولانا خیرالدین بھی کثیر قربانیوں کے بعد جبکہ غدر کا قیامت خیز اثر کچھ کم ہو رہا تھا تو ملک کی تباہی و بربادی اور عبرتناک مناظر سے دل برداشتہ ہوکر حجازِ مقدس کی طرف چل دیئے اور مکہ معظمہ میں اقامت پذیر ہوئے۔

پورے اکیس برس بعد اس مقدس سرزمین اور متبرک ذروں میں مولینا ابوالکلام آزاد ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ آپکی والدہ ماجدہ بھی مدینہ منورہ کے مشہور خاندان کی ایک صاحبزادی تھیں جنہیں شیخ بن طاہر مدنی کہتے ہیں یہ خاندان بھی صوفیائے کرام دہر میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ حضرت شیخ بن طاہر ابوالکلام کے نانا شہرِ مدینہ منورہ کے مفتی تھے۔ علاوہ ازیں آپ گذشتہ زمانہ کے علمائے حجاز میں سے سرکردہ اور مکہ معظمہ اور بیت اللہ الشریف کے آخری مورث ہونے کا صحیح فخر رکھتے تھے۔

جناب آزاد کا شجرہ بہلول دہلوی اور شیخ جمال دین سے ملتا ہے جو کہ اکبر اعظم کے عہد میں واحد مانے ہوئے عالم تھے آپ کے والدِ بزرگ کی

اس قدر شہرت ہوئی کہ خود مختار شاہِ ٹرکی عبد الحمید خان نے آپکو اپنے ملک میں آنے کی دعوت دی۔ پہلے تو انکار کیا۔ پھر مسلسل اصرار پر آپ قسطنطنیہ چلے گئے۔ وہاں پہنچتے ہی تمام علمائے ٹرکی کے گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ہر طرف سے مخالفت شروع ہو گئی مگر چونکہ یہ شاہی مہمان تھے۔ اِس لئے اُن کی مخالفتوں کا کوئی اثر نہ ہُوا۔ آپ نے ہر طرح علمی سخاوت کا ثبوت دیا۔ اندر ہی اندر مخالف جماعتوں نے شاہ عبد الحمید خان کے خلاف بغاوتیں و سازشیں کیں۔ کئی جمہوریت پسند پارٹیاں پوشیدہ طور پر برابر کام کرتی رہیں مگر فتح و کامرانی شاہی وقار کو میسّر تھی۔ اُس دور میں آپ شاہی مہمان رہے۔ چاہتے تو تمام عمر کا باقی حصّہ اِسی طرح گذار دیتے مگر انہیں دُنیا پرستی کا شوق نہ تھا۔ اِس لئے اسقدر خدمتِ خلق میں سرگرم ہوئے کہ نہر زبیدہ (جو کہ خلیفہ ہارون الرشید نے اپنی نیک اور چہیتی ملکہ زبیدہ کے نام پر بنوائی تھی) کی مرمّت کی ٹھان لی۔ چند ماہ میں گیارہ لاکھ روپیہ اکٹھا کر کے اُس کی مرمّت کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ پھر فارغ ہو کر مکہ معظمہ آن ٹھہرے۔

مولانا آزاد کا اصلی نام محی الدین احمد ہے۔ گو دہلوی ہیں مگر عربی کہلانے کے بھی مستحق ہیں۔ اِن کے والد اِسے کبھی کبھی فیروز بخت بھی کہہ لیا کرتے تھے۔ بحساب ابجد "فیروز بخت" کے اعداد سے بھی ۱۳۰۵ھ ہجری سن پیدائش بن جاتا ہے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم تو اپنے والد بزرگ کے حضور میں ہی حاصل

کی۔ علم القرآن۔ علم الحدیث۔ فقہ۔ فلسفہ۔ علم منقول و معقول کا سلسلہ وار مطالعہ شروع کیا۔ خلافِ قیاس بہت ہی کم عرصہ میں تمام علومِ دینیہ وابتدائی آپ خاطرخواہ کامیابی سے حاصل کر گئے۔

والدِ بزرگ نے جب ہونہار بچے کو تیز فہم پایا تو جو زرّین نکات مولانا آزاد کو سمجھانے تھے۔ از خود ہی مولانا آزاد سمجھنے لگے۔ اِس شاندار رفتارِ مطالعہ کو دیکھکر باپ بیحد مسرور ہوئے۔ پھر آپ کو قاہرہ کی مشہور ترین یونیورسٹی الازہر میں داخل کر دیا گیا۔ آپ نے صرف چودہ سالہ عمر میں ہی تمام علوم شرقیہ کا نصاب پورا کر لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ آپ کا مطالعہ وسیع ہوتا گیا۔ اِس یونیورسٹی کے کئی کہنہ مشق اُستاد بھی اس بچے کی ذہنی ارتقا اور ذہانت و تیز فہمی پر حیران رہ جاتے تھے۔ آپ سنِ شباب کو پہنچتے ہی جستجوئے حقائق کے متلاشی بن گئے۔ آپنے ہر مسئلہ کو اپنی نظر و علم میں جانچا۔ اور ہر معمولی سے معمولی بات کی تحقیق و تدقیق کی۔ جس ذہنی انقلاب کی جھلک آپ کی سوانح (تذکرہ) میں بھی ملتی ہے۔ آپ نے ہر بات کو ترمیم و تنسیخ کرکے اس کی اصلیت کے مطابق بیان کی۔ رفتہ رفتہ آپ کے ذہن میں کافی آزادی پرست خیالات جمع ہو گئے جس کے جواب میں آپکو رانچی میں نظر بند کیا گیا۔ اُس وقت آپکی عمر تیس برس تھی۔ اِس نظر بندی کے دوران میں آپ نے کتاب موسومہ تذکرہ لکھ ڈالی۔ اس تذکرہ کا ایک ٹکڑہ ملاحظہ ہو۔ جو سابقہ علمائے کرام سے انہیں انقلابی ثابت کرتا ہے:۔

"میرے لئے ناممکن ہے کہ کسی بات پر یقین لے آؤں۔ جب تک میں اُسے اپنی عقل کی کسوٹی پر نئے سرے سے پرکھ نہ لوں۔"

جب آپ عہد شباب کی بلندیوں میں پُہنچے تو ہر انسان کی طرح آپ نے بھی حیرت و استعجاب کی نظروں سے منازل شباب کو دیکھا۔ مگر ہر وقت قدم آگے بڑھانے کی خواہش جو کہ فطرۃً جوانی کا معمول ہے اُس نے اُن میں بھی جذبہ پیدا کیا۔ آپ نے اُس وقت قدرے مستقل مزاجی اور سنجیدگی سے کام لیا۔ جس کے نتیجہ میں آپ منزل عشق و حقیقت میں قدم انداز ہوئے۔ راستہ کی کڑی مصیبتوں کو سر پہ سہتے اور گوناگوں رکاوٹوں کا مردانہ وار مقابلہ کرتے، اس عشق و محبتِ حقیقی کی اُس منزل پر پہنچ گئے۔ جہاں صرف متاعِ درد اور جنس جان سپاری کے علاوہ کسی اور چیز کو مقبولیت نہیں ہو سکتی۔ کچھ ایام گذشتہ منزل تک پہنچنے میں بادیہ پیمائی کرنی پڑی پھر آپ تحصیل علم سے مکمل طور پر فراغت حاصل کر کے جامعہ ازہر مصر سے ہندوستان تشریف لائے اور آپ ساحل کے مشہور شہر کلکتہ میں مقیم ہوئے آپ نے اپنے دردمندوں کے خون و ایثار سے قوم کی کھیتی کو سینچنا شروع کیا۔ یہ جذبہ آپکے دونوں خاندانوں سے ورثہ میں ملا تھا۔ دورانِ تعلیم میں آپ اس کی برابر پرورش کرتے رہے۔

ادبی نظر میں

آپ نے ۱۵ سال کی عمر میں ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ سب سے پہلے آپ نے ایک ماہوار جریدہ لسان الصدق جاری کیا۔ جس میں ادبی، اخلاقی، تمدنی

جواہر پارے دریا دلی سے بکھیرے ۔ لٹائے ۔ مولانا الطاف حسین صاحب حالی نے لکھا :۔ کہ

۱۹۰۴ء میں آزاد ملے مگر یہ یقین نہیں ہوتا کہ لسان الصدق جیسے بلند پایہ اور وسیع و بلیغ اخبار کا ایڈیٹر کوئی ۱۶ سالہ بچہ بھی ہو سکتا ہے لیکن جب بالمشافہہ گفتگو ہوئی اور تبادلہ خیالات کا موقعہ ملا ۔ تو مولانا آزاد کی برق صفت تقریر اور معنی خیز اندازِ بیان اور عالمانہ طرزِ گفتگو نے حالی کو قائل کر لیا ۔ پھر فرمایا :۔

"جو قیمتی اور بے بہا موتی الفاظ کی شکل میں "لسان الصدق" کے صفحات پر میں دیکھتا رہا ہوں ۔ یقیناً اسی مجلّا دماغ کی پیداوار ہیں"۔

مولانا شبلی سے آپ کی اچھی خاصی خط و کتابت رہی ۔ آپ کا تعارف غائبانہ نوشت و خواند میں ہی ہوا ۔ زمانہ آیا کہ مولانا شبلی آپکی ملاقات کو تشریف لائے تو آپ سمجھے کہ آپ ابو الکلام کے بیٹے ہوں گے چنانچہ ابو الکلام سے مخاطب ہوتے ہی مولانائے محترم نے دریافت کیا کہ "کہو بیٹا! آپ کے ابا ابو الکلام کب باہر تشریف لا رہے ہیں ۔ اُن کے کیا کہنے ! میرے پاس اسقدر الفاظ نہیں جو تمہارے ابا جان کے علم و فضل کی صحیح تعریف کر سکوں"۔

جب مولانا شبلی کو بتایا گیا کہ مولانا ابو الکلام یہ خود ہی ہیں جو آپ کے سامنے ۱۶ سال کے بچّہ کی عمر میں کھڑے ہیں تو آپ بیحد متعجب و متحیّر ہوئے اور خوشی و مسرت کے مارے خدا کا شکر ادا کیا کہ واہ اللہ کیا کیا

نادرالوجود ہستیاں پیدا کرتا ہے جن کے طفلی کارنامے بھی ایسے ہیں۔ کہ لوگ دنگ رہ جاتے ہیں۔ اُنیسویں صدی میں ہندوستانی مُسلمانوں کی عجب سیاسی کیفیت تھی۔ سرسیّد احمد خاں اور اُن کے ہمخیال لوگوں کی کوششوں سے علیگڈھ کالج وجُود میں آچکا تھا۔ اِس میں مسلمان بچے اعلےٰ انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

مولانا محمد علی مرحوم۔ علامہ اقبال۔ مسیح الملک اجمل خان۔ ظفر علیخاں وغیرہ سب علیگڈھ کالج ہی کے صدقات ہیں۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں مسلم لیگ کا قیام کیا گیا۔ چند ملازمت پرست مُسلمانوں نے اپنے حقوق کی حفاظت کی خاطر ایک نمائندہ کمیٹی بنا کر اعلان کردیا کہ مُسلم ملازمین کہتر و مہتر کی ہمدرد جماعت مسلم لیگ ہوگی جو کہ حکومت سے باقاعدہ ہر معاملہ میں حصّہ لیگی۔ کہا جاسکتا ہے کہ مولینا محمد علی مرحوم واحد ہستی تھے جس کے نام نامی سے ہر ہندی واقف ہے۔ انہوں نے مُسلم لیگ کی بنا ڈالی تھی۔ آپ نے اپنے پاکیزہ خیالات کا واحد ترجمان اخبار "کامریڈ" جاری کیا۔ جسکی پہلی اشاعت ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء کو ہوئی۔ جسکو کلکتہ سے اپنی سرپرستی میں آپ نے جاری کیا۔

اِس دَورِ جدید میں محترم مولانا ابوالکلام نے الهلال سنہ ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے جاری کیا۔ مگر اس وقت تک آپ کسی سیاسی جماعت سے متعلق نہ تھے۔ اِس اخبار کے اِجرا نے آپ کو قوم پرست ثابت کیا۔ ہر دل میں اپنے قلم کے ذریعے گھر کرگئے۔ جِس جِس نے اُسے پڑھا۔ ضرور اثر لیکر

بیٹھ گیا اور ہمیشہ کے لئے آپکا شائق بن گیا۔ عوام بھلے چنگے معشوق کی طرح مولانا کے مضامین کی تلاش میں رہنے لگے۔ اس زمانہ میں جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا۔ مسلمانان ہند نے ترکوں کی ہمدردی کا دم بھرا۔ مگر سیاسیات کی مسلم لیگ اپنا کھلم کھلا فیصلہ نہ دیتی تھی کیونکہ ادھر حاکم وقت کے خوف و رعب اور ادھر برادرانِ اسلام ترک کی ہمدردی کا جذبہ۔ عجب کشمکش کی حالت تھی۔ آخر جنگ بلقان آ پہنچی:-

"کامریڈ" (یہ مولانا محمد علی کا اخبار تھا) اخبار الہلال (جو مولانا ابوالکلام آزاد کی طرف سے جاری ہوا) اس وقت کے لحاظ سے دونوں کی پالیسی میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ مولانا محمد علی نے "کامریڈ" کو ایک حیثیت سے صرف اسلامی رکھا۔ مگر حکومت کے نظریات کے مطابق بھی کچھ۔ چونکہ مولانا خود ایڈیٹری فرماتے تھے اس لئے اخبار کو جاری ہوتے دیر لگی مگر مقبول ہوتے دیر نہ لگی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں بڑے بڑے اخبار نویسوں نے آپ کے مقابل ہتھیار ڈال دیئے۔

الہلال کو آزاد نے ملکی۔ قومی ترجمان ہونے کا رنگ دیا۔ فرقہ دارانہ آلودگیوں سے پاک رکھا۔ حکومت سے صاف صاف اور کھری کھری کہنا پالیسی رکھی۔ غیر مسلم ہموطنوں کیلئے بھی سر توڑ کوشش کرتے رہے۔ اسی قسم کی مخلوط پالیسی کو تادمِ آخر جاری رکھا۔ اِدھر مولانا آزاد بھی اخبار الہلال کی ایڈیٹری فرماتے تھے۔ آپ کی انشا پردازی، اخبار نویسی، دلچسپ طرز بیان طرز انشاء سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ اخبار بھی "کامریڈ" سے کسی طرح بھی کم نہیں رہا۔ اس کو

لارڈ ہارڈنگ۔ سرجیمس میسٹن اور گورنمنٹ ہند کے دیگر مدبران کے ہاتھوں تک رسائی نصیب ہوئی۔

اس دور میں حکومت نے اپنا صدر مقام کلکتہ چھوڑ کر دہلی مقرر کیا۔ لہٰذا کامریڈ" نے بھی اپنا دفتر کلکتہ چھوڑ کر دہلی مقرر کیا۔ مگر اسے دہلی کی آب و ہوا راس نہ آئی۔ پھر کئی مشکلات کا سامنا آن پڑا۔ جس کا نتیجہ کامریڈ کی عارضی خاموشی ہوئی۔ مگر الہلال جنگی اخبار کو اپنے کالموں میں جگہ دیتا رہا۔ تبصرہ کرتے کرتے مسلمانان ہند کے جذبات میں حکومت کے خلاف بھی کچھ کہا اور لکھا جاتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۹۱۵ء میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کی کاری تلوار سے "الہلال" حلال کر دیا گیا جو پارۂ آتش کی چنگاریوں کا مجموعہ تھا، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرد کر دیا گیا۔

سیاسی تبدیلی

مسٹر وزیر حسن جو مسلم لیگ کے جنرل سکرٹری تھے۔ آزاد سے ملے۔ تو متفقہ طور پر یہ تجویز کیا کہ مسلم لیگ مطلق العنانی برطانی حکومت سے اندھی وفاداری کا نصب العین بدل کر مناسب قسم کی سلف گورنمنٹ کو اپنی منزل قرار دے۔ تو میں خوش ہوں۔ اِس دور میں کانگرس پارٹی بھی دادا بھائی نوروجی کی سرکردگی میں کافی ابتدائی مراحل طے کر چکی تھی۔ سیاسیات میں سوراج کا لفظ بھی داخل ہو چکا تھا مگر مکمل آزادی کے خواہاں اور نکتہ رس صحاب کے نزدیک اِس لفظ کے معنی کچھ نہ تھے۔ اُس وقت مولانا آزاد کی رائے تھی کہ ہمارے نظریہ کی آخری حد کیلئے

یہ لفظ ناکافی ہے مگر مُسلم لیگ کے لئے اس طرح کانگرس کی حمایت میں زبردست چھلانگ لگانا تھی۔ جس کی ہمت وُہ اپنے اندر نہ پاتی تھی۔ اس زمانہ میں مولانا آزاد نے البلاغ اخبار نکالا۔ اس میں بھی وہی قلم۔ وہی دماغ۔ وہی زبان، استعمال کی جو "الہلال" میں تھی۔ حکومت نے فوراً تاڑا۔ اور چند اشاعتوں بعد ضمانت مانگ لی۔ آخر ضمانت ضبط ہوگئی اور آپکو حدود بنگال سے چلے جانے کا حکم ۲۳ مارچ ۱۹۱۶ء کو مل گیا۔ آپ نے بمبئی۔ یوپی۔ پنجاب میں قیام چاہا۔ مگر ان سب حکومتوں نے مشترکہ ماں کا دودھ پیا ہوا تھا۔ وہی حکم ہر ایک نے مشتہر کر دیا۔ آخر بے خانماں رانچی میں قیام فرما ہوئے۔ ۵ ماہ ہوئے ہونگے کہ آپکو ایک گاؤں مورآبادی میں تن تنہا نظر بند کر دیا۔ پھر ایک عرصہ کے بعد رہائی ملی۔

گاندھی جی نے جب قومی اخبارات کا مطالعہ کیا تو اُن میں شہرتِ مولانا بھی دیکھی۔ ادھر مولانا نے سمجھا کہ جب تک ملک بھر میں کوئی سیاسی منظم جماعت قائم نہ ہو جائے۔ انفرادی ایثار و قربانی سے مُلک آزاد ہونا مشکل ہے آپ نے ۱۹۲۱ء میں گاندھی جی سے ملاقات کی۔ تبادلہ خیالات ہوا۔ اور گاندھی جی کے اصُول سے آپنے اتفاق کر لیا۔ آج تک اُسی نظریہ پر قائم ہیں۔ گو آپ چند سال تک آل انڈیا مُسلم لیگ۔ خلافت کمیٹی کے صدر بھی رہے ہیں مگر اپنے انقلاب پسند دماغ کی صحیح ترجمانی کیلئے کوئی موزوں مقام ڈھونڈتے رہتے تھے۔ زمانہ و وقت کی رفتار نے آپکو کانگریس تک پہنچا دیا۔ پھر آپ ۱۹۳۳ء میں سوراجیہ پارٹی میں شامل ہو گئے اور مسلم لیگ و دیگر اداروں

سے قطعی طور پر علیحدہ ہو گئے ۔ آپ کو سی ۔ آر ۔ داس اور موتی لال نہرو کی پارٹی کا روح رواں کہا جاتا تھا

کانگریس میں آپکی شرکت مسلمانان ہند کیلئے ایک اُلجھے ہوئے سوال کا حل تھا ۔ اسی دوران میں کتنے ہی آزاد خیال مسلمان کانگریس سے وابستہ ہو گئے ۔ ۱۹۲۳ء میں ایک تاریخی اجلاس دہلی میں ہوا ۔ جس کانفرنس کے صدر مولانا منتخب ہوئے ۔ علاوہ ازیں ہر سال ورکنگ کمیٹی آل انڈیا کانگریس کے مشیر اعلیٰ رہے ہر سیاسی الجھن کو سلجھاتے وقت آپکی موجودگی نے کانگریس کو کہنہ مشق حکیم کا کام دیا ۔ مہاتما جی ۔ جواہر لعل الغرض سب لیڈران ملک آپکو بہترین مُوَرِّ مملکت کے جاننے والا لیڈر تسلیم کرتے ہیں ۔ سب کو آپکا احترام ملحوظ خاطر ہے ۔

جس جگہ آپ کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ زبان میں سلاست و روانی اسقدر ہے کہ احاطۂ قلم میں نہیں آسکتی ۔ آپ مجمع میں بولتے ہیں تو سحرانہ کلام کرتے ہیں ۔ جو چاہیں ۔ عوام سے کہلوالیں ۔ اسی وجہ سے آپکو کلام کا باپ کہا گیا ہے علمائے ہند نے آپکو مؤثر مقرر ۔ جید عالم اور امام الہند تسلیم کیا ہے سال گذشتہ میں آپ آل انڈیا کانگرس کے صدر تھے جس اجلاس میں کوئی جھگڑا ہو جاتا ہے ۔ اُس میں آپکی شخصیت کو پیش کرنے سے تمام فروعات و فتنے سو جاتے ہیں ۔ ورنہ کئی بار کانگریس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہزاروں مختلف الخیال پارٹیاں بن گئی ہوتیں ۔ جمعیت العلماء ہند نے بھی آپکے نقش قدم پر ہر وقت جانے کی تلقین کی ہے اور اُن کے اکثر علما کانگریس کا کام اپنا اسلامی فرض سمجھ کر کرتے رہے ہیں ۔

گاندھی مختلف نظروں میں

سرمایہ دار کی نگاہ میں

ہم سمجھتے ہیں کہ مہاتما جی کے دم سے ہماری زندگی ہے۔ یہ ہمیں ہر تحریک میں لڑکر کچھ نہ کچھ آئینی رعایات اور اصلاحات لے دیتے ہیں جسکا کم وبیش فائدہ ہم لوگ اُٹھاتے ہیں۔ یہ گاندھی کی سرگرمیوں کا نتیجہ تھا۔ جو ہمیں سات صوبوں میں حکومت حاصل ہوگئی تھی۔ ہم نے اسمبلیوں کی سب نشستوں پر قبضہ کیا۔ عوام کو گاندھی جی نے یُوں سمجھایا کہ ہم سب ایک قوم ہندوستانی ہی ہیں۔ ہماری ہر صُوبہ دار کیبنٹ نے کسی جاگیر دار یا سرمایہ دار کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا۔ ورنہ ہندوستان کی غریب پرجا ہر وقت ہمیں لوٹ مار کر کھانے کو تیار رہتی ہے۔ کانگریس نے عوام کو پُرامن رہنے اور شانت مئی کا سبق دے رکھا ہے۔ ہم اگر چندے وغیرہ دیتے ہیں تو گاندھی جی ہمارے خلاف کوئی تجویز بھی تو پاس نہیں ہونے دیتے۔ ہر شہر کی کانگریس مِل مالکان کے سمجھوتوں میں مزدوروں کا ساتھ نہیں دیتی۔ پھر اِس کے علاوہ تمام ورکنگ کمیٹی پر قبضہ ہم سرمایہ داروں کا رہتا ہے۔ اگر کوئی انتہا پسند زیادہ چوُن وچرا کرتا ہے تو گاندھی جی فوراً استعفےٰ داخل کرنے کی دھمکی دے کر اُسے چُپ کرا دیتے ہیں۔ کسی کسان لیڈر یا سوشلسٹ کی مجال نہیں۔ جو ہماری لیڈری کے خلاف مُلک بھر میں

آواز بلند کر سکے۔ جب کوئی سر اُٹھاتا ہے تو مہاتما جی اُن کو کچل کر رکھدیتے ہیں۔ ہم ہزاروں روپے خرچ کر کے نمایندگی آل انڈیا سیشن میں اپنے ہم خیال لے جاتے ہیں۔ وہ غریب لوگ کسان و مزدور لیڈر بمشکل ہی ہمارے اجلاس تک پہنچ پاتے ہیں۔ پھر اُن کی ہمت کہاں جو وہ مُلک بھر میں اکثریت ڈیلیگیٹوں کی اپنے ساتھ لے جائیں۔

حکومت نے مہاتما اور کانگریس کو واحد رہنما جماعت تسلیم کر رکھا ہے جب چاہتے ہیں۔ حکومت سے بات چیت کر لیتے ہیں۔ کانگریس کو غریب پرجا اپنی جماعت سمجھتی ہے۔ کسان اپنی جماعت کہتے ہیں مگر قبضہ ہمارا رہتا ہے۔ اس لئے اس سے بہتر مفید جماعت اور لیڈر ہمارے لئے دُنیا میں ملنا مشکل ہے۔ ہمارا سہارا صرف گاندھی ہے۔ اس پر اندھ وسواسی ہندوستانی پورا اعتماد رکھتے ہیں۔ ہمیں ہر خطرہ سے بچانے کیلئے اسکی ہستی کافی ہے۔ ہمیشہ ہر کسان و سوشلسٹ کے مقابلہ میں گاندھی جی ہماری قدر زیادہ کرتے ہیں، عمل و فعل میں بھی ہمیں ہر طرح فائدہ پہنچاتے ہیں۔ ہر تحریک کو چلانے سے پیشتر ہم سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ جس سے ہمارے دیسی سرمایہ کا نقصان نہ ہو۔ وہ کام چلاتے ہیں۔ آج تک ساری تاریخ کانگریس میں کوئی تحریک ہم سرمایہ داروں کے خلاف نہیں ملتی۔ اس لئے ہمیں مہاتما جی کی رہنمائی کی استقامت کے لئے ہر ممکن قربانی کرتے رہنا چاہئے۔

کسانوں کی نظر میں

ہم نے اس پر بے شمار دفعہ اعتبار کیا۔ ہزاروں بار پولیس سے

ڈنڈے کھائے۔ مالیانہ آبیانہ روک کر گاؤں برباد کیے۔ ٹیکس کی جبری وصولی میں لاکھوں روپوں کے نقصانات برداشت کیے۔ اس گاندھی نے جب کب حکم دیا۔ ہم نے مالیانہ روک لیا۔ مگر ہر تحریک کے انجام پر اس گاندھی نے ہمیں ہمیشہ دھوکا دیا۔ اس نے ہماری پروا کبھی نہیں کی۔ جب چاہا۔ سرمایہ داروں کو فایدہ پہنچایا۔ اور صلح و لڑائی کرتے وقت ہم سے کبھی مشورہ بھی نہ مانگا۔ ہاں جب چاہا۔ ہمیں حکومت سے لڑوا دیا۔ مالیہ بند کر دیا۔ جب ہمارے گاؤں جلسے کرتے۔ تو سب کانگرسی لیڈر گاندھی جی کا پیغام یوں دیتے کہ تمہارے مالیے آدھے ہو جائینگے تمام مالیانہ صورت جنس ادا کیا جائے گا۔ تمہارے بچّوں کی تعلیم مُفت ہو گی ÷ تمہاری بہتری کی خاطر یہ جنگ کانگرس لڑ رہی ہے۔ تم کانگرس کے لئے قید ہو جاؤ۔ ہم قید و بند میں جاتے رہے۔ کھیتیاں برباد کرتے رہے مگر ہر تحریک کے کامیاب و ناکام ہونے پر ہمیں وہی مالیانہ ادا کرنا پڑتا۔ ہمیں وہی آٹھ پہر مزدوری و کرت کر کے روٹی کھانی پڑتی۔ ہمیں ہرگز ہرگز ایک پائی کی رعایت بھی نہ ملتی بلکہ جبری وصولی کا خرچہ یا ٹھیکری پہرہ کا خرچہ ہم سے الگ وصول کیا جاتا رہا۔ جب حکومت و گاندھی کی صلح ہو جاتی تو مہاتما گاندھی کے ایجنٹ کانگرسی لیڈر ہم کسانوں زمینداروں سے جبری مالیانہ وصول کرنے میں مددگار بن کر گاؤں گاؤں پولیس کے ہمراہ پھرتے رہے۔ ہم نے سمجھ لیا ہے کہ ہمیں جب سات صوبوں میں حکومت حاصل ہوئی تو پھر گاندھی جی اپنے وعدے پورے نہ کر سکے۔ ہمیں مالیہ میں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ چھوڑ سکے۔

بلکہ ہمارے اجتماعوں پر انگریزی حکومت سے زیادہ بار گولیاں چلائی گئیں۔ ہمارے جلسوں کو لاٹھیوں سے منتشر کیا گیا۔ ہر صوبہ میں ہمارے ساتھ ظلم و تشدد روا رکھا گیا۔ ہم نے تاڑ لیا ہے کہ یہ قوم پرستی کے نام پر ہم کسانوں کو دھوکا دیکر سرمایہ داروں کی امداد کرتا ہے۔ ہمارے لئے یہ لیڈر کسی طرح بھی مفید نہیں ہے یہ مانا کہ ہمارے ساتھ یہ سات صوبوں کے حکمران ہونے کے باوجود بھی کوئی رعایت کرنے کے مجاز ہی نہ تھے تو پھر یہ صوبہ دار حکومتیں لیں کیوں؟ کیوں ہم پر گولیاں برسائیں؟ کیوں ہمیں ذلیل کیا؟ ہماری بڑھتی ہوئی ہر تحریک کو کیوں دبایا؟ ہم نے آل انڈیا کانگرس کے مقابلہ میں اپنی آل انڈیا کسان سبھا قائم کرلی ہے جس کے خلاف گاندھی جی نے کافی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں۔ بہت دفعہ اُس نے بیانات میں کہا کہ کسان سبھاؤں کی ضرورت نہیں تھی بلکہ یہاں تک کہہ ڈالا کہ کانگریس کی موجودگی میں کسان سبھا کی بالکل ضرورت نہیں ہے سو یہ بات پختہ ہو چکی ہے کہ گاندھی ہم کسانوں کے لئے کسی طرح بھی مفید ثابت نہیں ہوا۔ اس امر کی تصدیق گاندھی جی کی گذشتہ زندگی کرتی ہے جس میں سے کوئی ایک مثال ایسی نہیں ملتی جس سے گاندھی جی قول و فعل میں کسان کا حمایتی ثابت ہو۔ ہاں کئی بار اُس نے کہا ہو گا از روئے فن۔ تقریر میں ہر لیڈر کہتا رہتا ہے کہ ہندوستان کسانوں کا ملک ہے۔ اس کی آبادی کا اکثر حصہ زمینداری و کاشت پر گذارہ رکھتا ہے۔ اس لئے اس کے نسازل کی حالت زیادہ قابل غور اور قابل توجہ ہے۔ مگر گاندھی جی کے حواریوں میں سے ہر جاگیردار اور زمیندار نے ہمیشہ گاندھی ٹوپی پہن کر ہمارے کسانوں کے

لہو کو پانی کی جگہ پیا اور ہمارے گوشت کو مزیدار کھانوں کی صورت میں کھایا مگر ہم پر ہرگز ہرگز ایک پائی کا خرچہ تک نہیں کیا۔ ہم کیا جانیں کہ یہ گاندھی ٹوپی والے سرمایہ پرست ہمارے دشمن ہیں یا مشیر! جبکہ ہماری کمائی کو لوٹ لیں۔ ہمیں جب چاہیں۔ ہمارے ووٹ کانگرس میں ڈلوالیں۔ ہمارا چندہ فیس ممبری اپنی گرہ سے دیکر ہمیشہ خود ہمارے نمایندہ بن کر کسانوں کی طرف سے رہنما بن جائیں۔ اور وہاں ہمارے فائدہ کا کبھی کوئی ریزولیوشن نہ پیش کریں۔ نہ پاس ہی ہونے دیں۔ تو ہم کس طرح اِن گندم نما جو فروش لیڈروں کو اپنا صحیح لیڈر سمجھ لیں۔ یہ گاندھی ہمارے رزق۔ وقار اور سیاست پر براہِ راست ڈاکہ ڈال چکا ہے۔ ہم ایسے بیوفا لیڈر پر ہرگز ہرگز اعتماد نہیں رکھتے۔ ہم تو جہاں تک ہوگا۔ ہم کانگرس میں صرف سیاسی آزادی کی خاطر شمولیت رکھیں گے اور اپنی اقتصادی اور جماعتی مقاصد و فوائد کیلئے کسان کمیٹی کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنائے رکھیں گے۔

گاندھی سوشلسٹ

مہاتما گاندھی نے کئی بار اعلان شائع کرائے ہیں کہ میں خود سوشلسٹ ہوں۔ میرا سوشلزم بھی عدم تشدد سے ہی کامیاب رہیگا۔ سوشلسٹوں کے سوشلزم میں سرمایہ داروں کو کوئی جگہ نہیں ملتی۔ مگر میرا سوشلزم ایسا نہ ہوگا۔ اس سوشلزم میں امیروں، غریبوں، زمینداروں اور کسانوں، سب کو ایک سی جگہ ملیگی۔ میں جہاں مزدور کسان کی رکھشا کرونگا۔ وہاں زمیندار اور سرمایہ دار کی بھی حفاظت کروں گا ؛

اس قسم کے بیانات کو سوشلسٹ عیاری کہتے ہیں۔ کیونکہ اُن کے خیال میں سرمایہ دار اور مزدور کے اشتراکی نظام کا قائم کرنا اسی طرح غلط ہے۔ جس طرح سانپ اور انسان کی محبت قائم رہنا۔

مہاتما جی نے جس قدر زندگی گذاری ہے۔ وہ ساری کانگرس کے اصولوں پر پابندرہ کر بسر کی ہے۔ اس ساری زندگی و قربانی کا فائدہ کسی صورت میں بھی غیر سرمایہ دار کو نہیں ملا۔ جیسے پہلے پہل کانگرس نے بدیشی مال کا بائیکاٹ کیا تو اس پروگرام سے یہ فائدہ ہوا۔ کہ سرمایہ داروں کی دیسی صنعت کاری کی قدر بڑھ گئی۔ بدیشی کی جگہ دیسی مال جاری ہو گیا۔

اِس صورت میں بھی دیسی سرمایہ دار کی مِلوں کو فائدہ ہوا۔ مِلوں کے مالک مزدور نہ تھے اور نہ ہی دیسی مزدوروں کو کسی مالکِ مِل کی طرف سے فائدہ میں سے کوئی بونس (Bonus) کا حصّہ ملتا ہے۔ ہاں مزدور نے کام کیا، تو مزدوری مل گئی۔ مگر اکثر اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ جس قدر زیادہ فائدہ مالکانِ مل کو ہوا۔ اسی قدر وہ زیادہ ذلیل رکھتے ہیں کیونکہ اُنہیں اپنے فائدہ کے خمار میں مزدوروں کی پرواہ نہیں رہتی۔ ہر وقت اُن کی مزدوری کو سستا سے سستا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ بدیشی بائیکاٹ سے ثابت ہوا۔ کہ مالکانِ مِل کو زیادہ سے فائدہ پہنچا تو بڑے سیٹھ جمنا داس بجاج وغیرہ نے لاکھوں روپیہ کانگرس کو دان دیئے۔ وہ دان صرف اس لئے دیا جاتا ہے کہ کانگریس کی تحریک اور زوروں پر کامیاب ہو۔ تو بدیشی ممالک کے مال کا بائیکاٹ اور اُس پر پکٹنگ دستیہ گرہ جاری رہے تو لوگ دیسی مال خرید کریں جس سے

دیسی ملوں کا مال فروخت ہوتا رہے۔

کانگریس کی ساری گذشتہ تحریک جو بھی مہاتما نے چلائی۔ اُن سب کا فلسفہ بھی ایسا ہے کہ سرمایہ دار کے ہاتھ میں ہی کانگرس رہی۔ دیکھئے کانگریس جب کوئی تحریک جاری کرتی۔ اُس میں والنٹیر درکار ہوتے تھے۔ بے کار لوگ والنٹیر بن جاتے تو اُن کو روٹی۔ کپڑا رہائش وغیرہ کیلئے روپیہ درکار ہوتا۔ اُس کا انتظام چندہ بازی سے ہوتا۔

یہ تو ہر آدمی جانتا ہے کہ چندہ ماسوائے سرمایہ داروں کے اور کوئی کیا دے سکتا ہے۔ چنانچہ یہ بات بھی صاف ہو چکی ہے کہ سرمایہ دار ہرگز ہرگز چندہ اپنے مفاد کے خلاف جماعت کو دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ کانگرس کو چندہ محض اسی لئے دیتے رہے کہ ان کا مفاد کانگریس کے پروگرام سے حاصل ہو جاتا رہا۔

وزارتیں، حکومتیں لیں تو اُن سے کونسا فائدہ عوام کو پہنچا؟ وہی سرمایہ دار جاگیر دار اور بڑے بڑے سرمایہ دار مذہبوں کو اُن وزارتوں سے فائدے پہنچے کسی مالک مل کے خلاف۔ کسی کانگرسی وزارت نے مزدوروں پر گولی چلانے پر مذمت کا ریزولیوشن بھی پاس نہ کیا۔ کسی جاگیر دار کے ظالمانہ رویئے کے خلاف کوئی تحقیقاتی کمیٹی بھی نہ بٹھائی گئی۔ کسی فرد کسان کو لگان میں تخفیف حاصل نہ ہوئی کسی مزدور کی تنخواہ میں ایک پائی کی ترقی نہ دلائی گئی۔ سوشل سٹیٹ پر ان وزارتوں نے کوئی نمایاں اثر پیدا نہ کیا۔ ہاں سرمایہ داروں کی حفاظت کے سامان اور کئی قانون پاس ہوتے رہے۔

اِسی لئے گاندھی جی کو وُہ لوگ صرف سرمایہ داروں کا لیڈر خیال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس موقعہ پر بھی کسی صوبہ یا ملک میں انقلابی جذبہ پیدا ہوتا رہا۔ ہر ایسی جگہ پر عوام کو دبانے کے لئے گاندھی حکومت کا ساتھ دیتا رہا ہے۔ اندریں حالات ایسے انقلابی لیڈر ہرگز ہرگز نہیں کہا جا سکتا بلکہ رجعت پسند آدمی ہے۔ اِس کی وجہ سے ملک میں انقلاب رُکا پڑا ہے۔ اُن کی رائے ہے جب تک مہاتما گاندھی کی موت نہیں ہوتی۔ تب تک کسی تحریک کو ہندوستان میں فروغ حاصل ہونا مشکل ہے:

خاکسار کی نِگاہ میں

ہم چاہتے ہیں کہ ملک میں فوجی علم و تربیت ہو۔ سب سے زیادہ اس امر پر زور دیا گیا کہ مسلمان چونکہ نسلاً بعد نسلٍ جنگجو قوم ثابت ہوئی ہے۔ اِسلئے اسے پہلے اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا گیا۔ اب تو ہندو سکھ سب قوموں میں خاکسار یا از قسم تحریک تر سول پارٹی سکھ فوج وغیرہ پیدا ہو گئی ہیں۔ اور خاکساروں میں بھی ہندو سکھ خال خال نظر آنے لگے ہیں۔ خاکساروں نے گاندھی کے خلاف بڑے لمبے لمبے بیانات دیئے۔ جن کو سب آنکھوں نے شاید نہ پڑھا ہو۔ مگر اُن سب کا نچوڑ جو کچھ خاکسار کے نقطۂ نگاہ کے مطابق مجھے نظر آیا ہے۔ وُہ یہ ہے:۔

گاندھی کی ہر تحریک ہمارے مُلک کو بزدِل بناتی ہے۔ جیسے عدم تشدد سے بہادری کے ارادے۔ سپاہیانہ زندگی کے جذبات۔ قوم پر جاں سپاری کے احساسات سب مفقود ہو جاتے ہیں۔ ہر وُہ انسان جو ہر روز ہاتھ جوڑ جوڑ

کر زندگی بسر کرے۔ وہ ہرگز ہرگز بہادر جنگجو نہیں بن سکتا۔ اس میں روحانی غلامی داخل ہو جاتی ہے۔ اس کی اگلی نسل بھی بہادری و دلیری کی حمایتی نہ ہوگی کیونکہ مہاتما گاندھی، سپاہی کی بہادری یا میدان جنگ میں جان بازی کے کاموں کو بہادری کی بجائے جہالت و بیوقوفی تصور کرتے ہیں۔ اس لئے ایسے رہنما کی زیر نگرانی کوئی ملک بھی اپنے نوجوانوں کو دلیرانہ انقلاب کرنے کی طرف ہرگز ہرگز مائل و راغب نہیں کر سکتا۔ وہ تو ہر طرح سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی حفاظت کی خاطر مظلوم و غریب عوام میں سے اُن کی بہادری و دلیری کے جذبات کو بزدلی و رحمدلی کے بھکاری کی تمناؤں سے بدلنا چاہتا ہے۔ تاکہ سرمایہ داروں کے دروازوں پر غریب مزدور جو کہ سب کچھ ہاتھوں سے کماتا ہے۔ اپنے پیٹ کیلئے کوئی تشدد نہ کرے بلکہ سرمایہ داروں سے ہاتھ جوڑ کر تمام عمر مانگتا مانگتا مرجائے مگر اُس میں ہاتھ اُٹھانے کی جرأت باقی نہ رکھے۔ ایسے عمل و فعل سے یقیناً ملک بھر کے نوجوانوں کے مستقبل کا ناس ہو جائیگا۔ اُن کی رائے ہے کہ ایسے لیڈر سے جس قدر جلد قوم کے سپوتوں کو بچا لینا چاہیے۔ کیونکہ آج ضرورت وقت یہ تقاضا کرتی ہے کہ جب تمام دنیا بھر کی اقوام میں سامان حرب روز نیا اور طریق حرب روز نئی طرز ہوتا ہے۔۔۔ ہر قوم کا بچہ بچہ سپاہی اور مرد و زن میدان کارزار میں کام آتے ہیں۔ تو کیا وجہ؟ ہم اس لنگوٹے بند کی رہنمائی کو نہ چھوڑیں۔ ہم دنیا میں تپسیا کرنے نہیں آئے۔ ہم ہندوستان میں سادھو پیدا کر کے تمام دنیا میں سادھو فروشی کی تجارت نہیں کرنا چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہر قوم کے پہلو بہ پہلو قدم بہ قدم

ترقی کریں۔ آج ہم عدم تشدد کو چھوڑ کر ملک کو فوجی پریڈ سکھلائیں۔ ہوائی جہازوں میں نوجوانوں کو اُڑائیں۔ سمندروں میں ہمارے ہنرمند کام کریں۔ توپوں اور ٹینکوں پر قبضہ ہمارے ہندی جوانوں کا ہو۔ ہر ہفتہ ہم اجتماع فوجی شہر بہ شہر کریں۔ تمام ملک کے باشندے فوجی نظم و نسق قائم کریں۔ ہم جب چاہیں۔ جس ملک سے خطرہ ہو۔ اُس کے مقابل ڈٹ جائیں ہم اپنے نوجوانوں کے بل پر ہر ملک کو مُنہ توڑ جواب دیں۔ ہم ابتدا سے ہندوستانی کبھی عربوں کے غلام۔ کبھی ایرانیوں کے غلام۔ کبھی موسائیوں کے غلام اور آج عیسائیوں کے غلام نہ بنیں بلکہ ہم ہر ملک کو غلامی کی بجائے آزادی کا سبق دیں ؎

اس گاندھی کے اصولوں نے سیاست میں روحانیت شامل کرکے

سیاسی جرأت اور انسانی دلیری کو اس قدر دبا دیا ہے۔ ملک میں بزدلی اور کم حوصلگی پھیل گئی ہے۔ ہر آدمی موت سے گھبراتا ہے۔ موت کے خوف سے ڈر کر چھپ جاتا ہے۔ اگر آج فوجی تربیت کا ملک حامی بن گیا ہوتا۔ تو موت کو معمولی کھیل سمجھتا۔ ہر آدمی موت سے پیار کرتا۔ فوجی سپاہی موت کو جلدی ملنے سے اپنی کامیابی خیال کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو ملک فوجی نظام و تربیت کو پسند کرتے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں مرتے ہیں اور لاکھوں کو مارتے وقت ذرہ بھر دریغ نہیں کرتے۔

پھر وُہی مرنے اور مارنے والے آزادی کے مزے لیتے ہیں۔ جو لوگ موت سے ڈرتے ہیں وہ ہمیشہ اپنے مقصد میں ناکام رہتے ہیں۔ ہمارے ملک کو ناکام رکھنے والا۔ موت کا ڈر پیدا کرنے والا یہی نکما لیڈر گاندھی ہے نوجوانوں کو چاہیئے کہ اس کا ساتھ چھوڑ کر اپنا صحیح راستہ تلاش کریں۔ کیونکہ ہر غلام ملک نے فوجی نظام حاصل کر کے ہی اپنی نجات حاصل کی ہے۔"

کامریڈ لینن

لینن کا اصلی نام نکولی لینن تھا۔ دُنیا کی بزرگ ترین ہستیوں میں سے ایک تھا۔ بڑے بڑے مدبروں نے اس کی تعریف کی ہے۔ برنرڈ نشا جو کہ یورپ کے بہترین اہل قلم ہوئے ہیں۔ انہوں نے لکھا :-

"سب سے اعلےٰ انسان اور غریب عوام کی امید لینن ہے"

مسٹر رسل جو کہ کیمبرج کے پروفیسر ہیں۔ ان کی رائے ہے :-

"صحیح مفکر اور اصل حاکم لینن ہے"

یہ ایک غریب انسان کے بیٹے تھے۔ انہوں نے تمام روس میں اپنی رائے کا پرچار کیا۔ چند نوجوانوں کو ساتھ لے کر وقت بچاتے بچاتے انقلاب کیا۔

کارل مارکس کے فلسفہ کو جو کہ دُنیا بھر میں ناقابل عمل جانا گیا تھا، پُورا عمل کر کے اُسے راہ راست ثابت کر دکھایا۔

کارل مارکس صاحب فلسفہ ہوتے ہوئے اپنی تھیوری پر عمل کرنے کی لاکھوں تدبیریں سوچتا رہا۔ ہزاروں ترکیبوں سے کوششیں کرتا پھرا۔ آخر اُسے ناکامی حاصل ہوئی ؛

اگر لینن اُس کی موت کے بعد پیدا نہ ہوتا اور اُس کی تھیوری جو کہ

محض خیالی تھی۔ عملی شکل میں دُنیا کے سامنے نہ لاتا۔ تو یقیناً آج کارل مارکس کے کے فلسفہ کی کوئی وقعت نہ ہوتی۔

سوشلزم میں لینن کا سب سے اوّلین نام ہے۔ اس کی ہستی نے سوشلزم کی ہست و بود کا پتہ دیا ہے اس کی قربانیوں و جانفشانیوں سے ہی سوشل انقلابی پارٹیاں دُنیا بھر میں چمکی ہیں ✤ ورنہ چند سالوں کی تاریخ کے مقابل اگر چند صدیوں کی گذشتہ تاریخ کو لیا جائے تو لینن کی زندگی کے واقعات و انقلابات کے مقابلہ میں گذشتہ پُرانی تاریخ کی صدیوں میں واقعات و انقلابات کم تعداد میں نظر آتے ہیں۔

لینن کی شخصیت تھی جس نے اقتصادیات زمانہ میں انقلاب پیدا کرنے کی طاقت حاصل کرلی۔ اس نے کارل مارکس کے فلسفہ سے یہ راز لیا۔ اس نے تمام شہنشاہت پسند ممالک کو اپنے ملکی و قومی اتحاد عمل سے جڑوں سے ہلا دیا۔ اُس نے تمام ملک کو یک دل کر کے سرمایہ دارانہ ممالک کی جنسی پیداوار کو سستا کر دیا۔ پھر مارکیٹ کے نرخ گر گئے جس کا لازمی نتیجہ تمام دُنیا کے مزدوروں کی تنخواہ میں تخفیف آئی۔ اس تخفیف کے صدمات یہ ہوئے کہ ہر ملک میں انقلاب کی تیاریاں، ہڑتالیں، مزدوروں کی تنظیم وغیرہ کے پروگرام گرم ہو گئے۔ سرمایہ دار الگ اتحاد باہمی کرنے لگے۔ مزدور و کاشتکار جدا مشترکہ مرکز بنا بنا کر سرمایہ داری کے مظالم کا علاج سوچنے لگے ✤

کہیں مزدور کامیاب ہو گئے۔ کہیں کسان اور کہیں مشترکہ گورنمنٹ مزدور کسان بن گئی۔ کہیں مختلف الخیال فرقوں نے متحدہ مرکزی حکومت قائم

کر لی۔ الغرض ہر شاہ پرستی ہل چل گئی +

تمام دنیا نے جمہوریت کا مزا چکھا۔ جس ملک نے جمہوریت سے نفرت کی۔ اسی میں فوراً عوام نے گڑبڑ پیدا کر دکھائی۔ کسی ملک میں جعلی جمہوریت بنائی گئی۔ کسی میں اصلی۔ آخر وقت آیا کہ ہر تاجدار کو جمہوریت کا نام استعمال کرنا ہی پڑا۔ آج جگہ جگہ سوشلزم کا پرچارک ہے +

ہر سرمایہ دار اپنی خودغرضی کو سوشلزم کے پردے میں چھپاتا ہے۔ ہر خودغرض قوم پرست اپنے آپ کو سوشلسٹ کہہ کر اپنا کام چلاتا پھرتا ہے۔ آج کی دنیا میں سوشلسٹ کے نام پر لاکھوں دھوکے ہو رہے ہیں۔ یہ بڑتی لہر یہ انقلابی رو، یہ جذباتی فکر، یہ روشن دلیل، لینن اور صرف لینن کی عملی زندگی نے پیدا کر دی +

لینن کا ایک بھائی زار روس کے خلاف سازش کے الزام میں گرفتار ہوا جس کے ہمراہ اور پانچ ساتھیوں کو پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ اس نے تمام الزامات کا اکثر حصہ از خود اپنے سر پر لینے کی کوشش کی اور کہا کہ تمام کام جو کچھ بھی الزام ہے۔ صرف میں نے ہی کیا ہے۔ جسکا نتیجہ اس کو سزائے موت ملی۔ موت سے پہلے اس نے والدہ سے ملاقات کی تو فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ میری موت سے میری پارٹی کے دیگر رفقا کی زندگیاں بچ جائیں اور میں اپنی پارٹی کو سبق سکھانا چاہتا ہوں کہ ایک آدمی کی قربانی سے باقی سب کی جان اس طرح بچ سکتی ہے۔ اخلاق یہ ہے۔ کہا۔ میری الماری میں جو جو بھی کتاب جس جس دوست کی نکلے ان سب کو پہنچا دینا۔ تا کہ میرے روح پر ان کی طرف سے کوئی بوجھ باقی نہ رہے

جس کسی کا کوئی احسان یاد آیا۔ فوراً ہی اسکا عوضانہ ادا کر دیا۔ اس نے ثابت کر دکھایا۔ کہ اخلاق کسقدر اُن لوگوں کا بلند تھا۔ والدہ کو یہ کہتے ہوئے خوش خوش اپنے گلے میں از خود رسّی ڈال پھانسی پر لٹک گیا۔ اُس وقت اس بچے کی عمر صرف ۱۷ سال تھی +

اسکے بعد لینن نے اپنا بچپن چھوڑا سمبرسک جمنیزیم میں داخل ہوا۔ جہاں اُسکا اُستاد فیوڈر کرمنسکی تھا۔ جس کا لڑکا پروونشل گورنمنٹ کا منسٹر تھا۔ اُسے یہ شک بالکل نہ تھا کہ ایک روز یہی شاگرد لینن اُسی کے لڑکے کرمنسکی روس کے مرتبے کو چھین لیگا +

یہ سمبرسک والگا دریا پر واقع تھا۔ اس میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لینن پھر کازان میں داخل ہوا۔ جہاں سے اس کو خارج کر دیا گیا۔

سنہ ۱۸۹۱ء میں نیوا پر دارالخلافہ میں گیا۔ پیٹرسبرگ میں وکالت و سیاست کا مطالعہ کیا۔ پھر ایک زبردست مقالہ کارل مارکس پر شائع کیا جس پر اُسے مصنّف تسلیم کیا گیا۔

پلیکنو سوشلزم کے جنم داتا ہوئے ہیں۔ جب اُس نے یہ مسودہ پڑھا۔ تو کہا کہ کسی دن یہ نوجوان خطرناک انسان ثابت ہوگا۔

پھر سنہ ۱۸۹۷ء میں لینن زار کی گرفت میں آن پھنسا۔ اسے کچھ عرصہ کے لئے سائیبریا کے جنگلوں میں جلاوطن کر دیا گیا۔ پھر ۱۵ سال بعد لینن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا لیڈر بن کر دنیا کے سامنے آیا۔ ۲۵ سال بعد سوویٹ کانگرس سے بھی نکال دیا گیا + اس وقت عمل و خیالات دونوں تیز رکھتا تھا۔ مزدور اور اہل ہنر

کا صحیح ہمدرد لیڈر بنا۔

سائبیریا کے لق و دق سفر طے کرتا پھرا۔ پھر اُسے کچھ سزا ملی۔ پھر دارالعلوم میں اُس کے لئے کچھ پابندیاں عائد ہو گئیں۔ پھر لینن نے روس سے بھاگنا مصلحتاً پسند کیا۔

اُس نے مغربی یورپ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ لیڈروں کی حمایت سے ایک اخبار آسکرا جاری کیا۔ جو کہ جلد ہی تمام سوشلسٹوں اور جلا وطنوں کا مشترکہ اخبار بن گیا۔ اب سرفروشان وطن کو اس نے اپنے گرد جمع کر لیا۔ اور انقلابی خیالات کی نشر و اشاعت جاری رکھی ؛

بلجیم۔ فرانس۔ جرمنی۔ انگلینڈ۔ اٹلی میں مستقل طور پر جاتا رہا۔ یہ اخبار نہ چھپنے والی سیاہی سے لکھا کرتے تھے۔ اس انقلابی پارٹی کی ممبر لینن کی اپنی بیوی تھی۔ ۱۹۰۳ء میں برسلز و لنڈن میں پہلی دوسری کانگرس ہوئی۔ تو تفرقہ پڑ گیا۔ مرکزی پارٹی کی طرف سے لینن لڑا۔ اس کی اکثریت تھی۔ اس لئے اس کو بالشویک پارٹی کا لیڈر کہا گیا اور دوسری پارٹی کی اقلیت تھی۔ اس لئے اسے مینشویک کہا جاتا رہا۔

بالشویک پارٹی کا نام ۱۹۱۸ء میں کمیونسٹ پارٹی باقاعدہ طور پر تبدیل و مشہور کر دیا گیا۔ اگرچہ لینن اپنی پارٹی میں اکیلا ہی لیڈر تھا اور دیگر حالات کئی بار خراب ہو جاتے رہے مگر یہ دل نہ ہارا۔

۱۹۰۷ء میں کانگرس ہوئی۔ جس میں اُس نے طریق چناؤ۔ ضبطی جائداد نجی۔ روسی انقلاب کی تیاری وغیرہ پر مستند تقریر کی اور تجویزیں بھی مدلل رنگ میں

پاس کروالیں۔

۱۹۰۵ء میں جب انقلاب روس ہوا۔ تو عوام کو معافی نامہ عطا ہونے پر لینن بھی اپنے گھر لوٹے۔ چند دنوں بعد مخالف زور میں آئے تو فن لینڈ بھاگ گیا پھر سوئٹزرلینڈ و پیرس گئے۔ وہاں دو اخبار جاری کئے۔ ایک عوام کے لئے شائع کرتے اور دوسرے میں صرف فلسفۂ انقلاب اور انقلابی اصولوں پر بحث لکھتے۔ یہ روسی سرحد کو اکو نامی مقام پر جاری کئے اور خود وہیں قیام کیا۔ اس مرکز سے ہر انقلابی سے راہ ضبط جاری رکھا گیا۔ اس نے صنعتی ڈیماکریسی کتاب کا ترجمہ کیا۔ اس نے بیحد کتب لکھی ہیں۔

جنگ یورپ کے آغاز میں لینن آسٹریا کے مزدوروں کو باغی بتاتا پھرتا تھا آخر گرفتار و قید کیا گیا۔ پھر رہا ہوا۔ یہ سب سوشلسٹوں کا فرض تھا کہ ہر بات کو اس کے مشورے بغیر نہ کرتے تھے۔ یہ پھر سوئٹزرلینڈ واپس ہوا۔ جب زار ۱۹۱۷ء میں ہل چکا تھا۔ پھر اسے واپسی وطن کا خیال آیا۔

اتحادیوں نے مخالفت کی۔ فیڈریشن کونسلر نے بیشمار پلٹنیں رکاوٹ کے لئے بھیجیں مگر لینن صرف ایک سو انقلابی لیکر جرمنی سے روس جا پہنچا۔ عوام نے لینن کی آمد پر شاندار جلوس نکالا۔

لینن۔ مزدور۔ مساوات

جب لینن روس کے صدر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ تو مزدوروں کا ایک وفد اس کے پاس آیا۔ اور اس وفد نے کہا کہ فلاں کارخانہ ہم مزدوروں کو دیدیا جائے کیونکہ آپ کا تو صرف کاغذ و سیاہی کا خرچہ ہو گا مگر ہم مزدوروں

کے لئے زندگی کا ذریعہ نکل آئے گا۔

لینن نے سفید کاغذ ہاتھ میں لے لیا۔ اور سوالات کیئے کہ اگر آپ لوگوں کو یہ کارخانہ مل جائے تو تم اس کو باقاعدہ منظم حیثیت میں جاری رکھ سکو گے؟ جس طرح کہ ایک سرمایہ دار کارخانہ کو چلاتا ہے؟

مزدوروں نے کہا۔ ہاں! پھر پوچھا۔ تم کو علم ہے کہ کچّا مال اس کارخانہ میں کہاں سے آتا تھا؟ جواب ملا۔ نہیں! پھر پوچھا گیا کہ تم جانتے ہو۔ کہ تیار شدہ مال اس کارخانہ کا کس کس منڈی میں لگتا ہے؟ جواب ملا۔ نہیں!

لینن بولے۔ دوستو! جاؤ۔ پہلے ایسی صورتوں کو سمجھ لو۔ پھر چھ ماہ کے بعد میرے پاس آنا۔ میں تمہارے لئے اس سے بہتر کارخانہ کا انتظام کر دوں گا۔ سردست جو فرض تجھے تمہارے علاقے کا افسر دے۔ وہی کرو۔

لینن کی طرز معاشرت نہایت سادہ تھی۔ لباس عامیانہ تھا۔ اپنے ہر اصول کی پابندی کرتا تھا۔ اُسکی رائے تھی۔ کہ جس قدر ملکی بجٹ اجازت دے۔ اُسی قدر سب کی خدمت جاری رکھی جائے۔ اگر اچھی روٹی ملے، تو سب کو۔ ورنہ دال روٹی سب کو مل جانے کے بعد دوسرے لذیذ کھانے کو تقسیم کرو۔ وہ بھی سب کو میسر آئے تو بہتر ہے۔ ورنہ کسی ایک کو نہ ملے۔

اپنی زندگی میں وہ خیال رکھتا تھا کہ مجھے کوئی زائد رقم یا اپنے حصے سے زیادہ کی کوئی چیز نہ لینی چاہیے۔ مبادا اوسط آمدنی حصہ سے میرے اخراجات روزمرہ کسی دوسرے فرد حکومت و پبلک سے بڑھ نہ جائیں۔

ایک دفعہ لینن بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ یہ قریب المرگ ہے

تو ڈاکٹر بورڈ نے روزمرہ سے زائد قیمت کی دوائی تجویز کردی۔

فرمایا۔ یہ اصل حق سے کئی گنا زیادہ قیمتی دوائی ہے۔ یہ دوائی میں نہ کھاؤں گا۔ کیونکہ ایک مریض کے حق سے کئی دوسرے مریضوں کی حق تلفی ہو جانے کا احتمال ہے۔

لینن کئی کئی دن فاقوں رہتا تھا۔ ایک دفعہ امریکن مشنری اُسے ملنے آئے۔ تو اُن دِنوں لینن آٹھ دن سے بھوکا تھا۔ اور لینن کیلئے دیہاتی آٹھ سو ٹکڑے روٹی کے لائے۔ جو کہ کافی دُور دیہات سے پیدل چل کر آئے تھے۔ تو مشنری یہ واقعہ دیکھکر حیران رہ گئے۔ جیسے پھٹے پُرانے کپڑے اُس وقت اُن غریبوں کے تھے، ویسے ہی سارے مُلک کے حکمران نے پہن رکھے تھے۔

اُس کی تقریر جادو اثر ہوتی تھی۔ عوام کے جذبات کو نہیں، دماغ کو اپیل کرتا تھا۔ ہمیشہ اپنی ہر بات پر رائے عامہ کو وقعت دیتا اور بہترین دلیل کو لیڈر مانتا تھا۔

اُس کا قول تھا "دُنیا میں ہر انسان کی کامیابی اس راز میں ہے کہ وُہ ہر چیز پر شک کرے جب تک اُسے عملاً و فعلاً یقین نہ آجائے۔ اعتبار نہ کرے۔"

وُہ ہر سیاسی، سوشل حادثہ کے متعلق از خود ہی اُس کے ہونے سے پہلے اندازہ لگالیا کرتا تھا۔ اکثر اُسکا جائزہ درست ہوتا تھا۔ وُہ ہمیشہ ہر بات کو بار بار سوچتا تھا مگر جب کوئی فیصلہ اُس کی پارٹی تصدیق کردیتی تھی تو اُس پر

پُورا عمل کرتا تھا۔

لینن کی موت کے بعد اس کی جگہ سٹالن ڈکٹیٹر جمہوریت بنایا گیا۔ رُوس کی جمہوریت واشتراکیت صرف لینن کے دم خم سے ہی زندہ جاوید بن نکلی ہے۔

آج تمام دُنیا اس روس کی ترقی وکمال کو دیکھکر حیران ہے۔ آمریت اُس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے مگر جمہوریت کے قدم اس قدر مضبوط ہو چکے ہیں جس سے آج کی سیاست میں سٹالن اور اس کی پارٹی کامیاب ہوتی نظر آتی ہے۔

چند سال گذشتہ میں لینن کے تابعین کے متعلق یہ شبہ کیا جاتا تھا۔ کہ شاید لینن کے بعد اس کی جگہ کوئی کامیاب ڈکٹیٹر روس کو نصیب نہ ہوگا۔ مگر سٹالن کی رموز دانی اور کامیاب پالیسی نے ہر ہٹلر ومیسولینی کو راج انگریزی سے ایسا ٹکرادیا ہے کہ ہر دو مخالفوں کا آخر رُوس کے ہاتھ میں نظر آتا ہے۔

پہلے تو خیال تھا کہ جاپان۔ جرمنی۔ اٹلی۔ انگلینڈ مِل کر رُوس کا کچومر نکال دینگے مگر ماہرانِ سیاست روسیوں نے صُورت حالات کو خوب بدل ڈالا ہے۔ رُوس میدانِ جنگ سے باہر اپنے اِن سب مخالفوں کی جنگ دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔ ہر وقت ہر ہٹلر کو تھپکاتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ سٹالن انجام جنگ میں کامیاب ثابت ہوگا۔

یہ سب صفات لینن کے نقش قدم پر چلنے سے ظاہر ہُوئی ہیں۔ جس نے کارل مارکس کے ساتھ ساتھ عملی فلسفہ لینن ازم کے نام پر الگ کتاب لکھ ڈالی ہے ÷

خطبۂ صدارت مزدور کانفرنس ۱۹۴۱ء

تشکر۔ مَیں آپ حضرات کا بیحد شکر گذار ہوں کہ مجھ معمولی سے انسان کو آپ لوگوں نے اسقدر عالیشان اجلاس کی صدارت سے سرافراز کیا۔ مَیں خود بہت بڑی ہستی نہ تھا مگر استقبالیہ کمیٹی نے جس کرّوفر سے میرا خیر مقدم کیا۔ اُس کے حُسنِ انتظام کو صد ہزار تحسین کے قابل سمجھتا ہوں۔ مَیں یہ جانتا ہوں کہ لدھیانہ جیسے معمولی شہر میں آپ نے جو سر توڑ کوششوں و سرگرمیوں کا اظہار کیا ہے۔ یہ آپ کے شہریوں کی زندہ دلی کا مدلّل ثبوت ہے۔ یہ صرف آپ کا ہی کام ہے جو آپ نے نہایت شاندار پنڈال بنوایا۔ تمام ڈیلیگیٹ جو کہ ہندوستان کے چپّہ چپّہ سے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس کثیر تعداد کی لئے نہایت اعلیٰ رہائش کا انتظام کیا۔ صدر و مدبّران استقبالیہ کی محنت و دلچسپی میں کوئی کلام نہیں۔ بیشک آپ حضرات نے ہم مسافروں کی مہمان نوازی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ اِس لئے مَیں لدھیانہ شہریوں کا عموماً اور انتظامیہ کمیٹی کا خصوصاً تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

غرض و غایتِ اجلاس! ہماری جماعتی جدوجہد تو تاریخ کے پہلو بہ پہلو چلی آ رہی ہے مگر ہمیں مکمل کامیابی آج تک نصیب نہیں ہوئی۔ تمام دنیا بھر کے مزدور اپنے اپنے ملکوں میں خود راج کرتے ہیں۔ اپنی محنت کی برکت سے ہر حکومت اُن کے آگے جھک جاتی ہے۔ تمام اقوامِ عالم اپنے مزدوروں

کی عزت کرتی ہیں۔ اُن کے نمایندے قلمدانِ وزارت سنبھالتے ہیں۔ جگہ جگہ عہدے لیتے اور نہایت اعلیٰ اور بہترین قوانین بناتے ہیں۔ حتی الامکان ان لوگوں نے نوع انسان کی خاطر بہتری و بہبودی کیلئے کوشش کی ہے۔ ہمارے مُلک میں غلامی حکومت کرتی ہے۔ ہمارے مزدور تمام جوانی محنت کرتے کرتے گنوا لیتے ہیں مگر بڑھاپے میں نہ تو کوئی قانون، نہ ہی حکومت اور نہ ہی سرمایہ دار اُسکی مدد کرتا ہے آخر روڑی کے کُتّے کی موت آج ہم لوگوں کے مزدور مر رہے ہیں۔

ہمارے مُلک میں مزدور کی قیمت ۱۵ روپے اور ولائتی کُتّے کی قیمت ۲۰۰ روپے ہیں۔ ہم اس انسانیت سوز سلوک کے خلاف مدّتوں سے جدّوجہد کرتے چلے آئے ہیں۔ ہم ہر سال نیا پروگرام بناتے ہیں۔ ہر سال ریزولیوشنوں کے انبار پاس کرتے ہیں۔ شدید سے شدید ترین پالیسی تجویز کرتے ہیں مگر مگر ہمارا ہر نئے سال پھر وہی نظریہ سامنے رہتا ہے۔ وہی پروگرام نئے سرے سے زیرِ غور ہوتا ہے جس کا نتیجہ نئی کانفرنس اور نیا اجلاس ہو جاتا ہے لاکھوں روپے صرف کر کے شاندار پنڈال اور جلوس و جلسے ہوتے ہیں۔ پھر نتیجہ میں عمل وہی رہتا ہے۔ اقتصادی حالت وہی مزدور کی غریبی وہی، بیکاروں کو وہی فاقے۔ بوڑھے مزدوروں کو ملزمیں سے صاف جواب و دھکّے ملتے ہیں فیکٹری ایکٹ میں ہماری کافی حفاظت کی ضمانت ہے مگر وہ کاغذی امداد رہ جاتی ہے۔ روزمرہ کی عملداری اسکے برعکس ثابت ہوتی ہے۔

ہم چاہتے ہیں کہ اس اجلاس میں ان تکالیف کے لئے نہایت مؤثر پروگرام بنائیں اور نئے سال میں اُس پر عمل کریں تاکہ اُس پروگرام کی

جماعتوں کی واحد نمایندہ بن سکے۔ کانگرس جو کچھ کرے گی۔ مشترکہ اور واحد مانگ خالص ہندوستانی قوم کے نام پر پیش کرے گی۔ کانگرس۔ مزدور یا کسان کیلئے پیش نہیں کر سکتی۔ ایسا کرنے سے کانگرس ہندوستانی جنتا کی واحد نمایندہ نہیں بن سکتی۔ اس لئے سیاسی حقوق کیلئے اِس جماعت کو ہر طرح ہم امداد دیں تاکہ ہماری اِس واحد قومی جماعت کے خلاف حکومت ہرگز ہرگز کوئی غلط الزام نہ لگا سکے

کسانوں نے اپنے ملک میں کانگرس وزارتیں ہوتے ہی تمام صوبوں میں بڑی سے بڑی مانگیں اور خاص مطالبے حکومتوں کے سامنے رکھدیئے۔ جن کِسان نیتاؤں نے وُہ مطالبات بنلئے۔ اُن کی کم علمی اور نا تجربہ کاری ملاحظہ ہو کہ اُنہوں کے مطالبات نہ مانے جانے پر وُہ بگڑ کر سول نافرمانی شروع کر دیتے رہے مگر اس بات پر قطعاً غور نہ کرتے رہے کہ جب کانگرسی یا غیر کانگرسی صوبہ کی حکومت کو اُن کی مطالبات منظور و تسلیم کرنے کا مجاز ہی نہیں یا جو مطالبہ ہے اس کے لئے خزانہ اجازت ہی نہیں دیتا کہ اُن کا معاملہ ٹیکس وغیرہ آدھا کر دیا جائے تو صوبجاتی حکومت کا بجٹ فیل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں جو بھی ذمّہ دار وزارت ہو گی وُہ کب معاملہ کو اس حد تک گھٹا سکتی ہے۔ چنانچہ کوئی وزارت بھی ایسا اقدام نہ کرے گی جس سے اس کی وزارت فیل ہو جائے۔ خیر ایسا سب صوبوں میں ہُوا کہ غلط مطالبات رکھے کسان تحریکیں ہر جگہ تشدّد و ظلم کا نشانہ بن کر فیل ہوئیں اور اِن میں چند دِل گُردے والے ورکرز پیدا ہو گئے۔ جن دوستوں نے کسان سبھا کو آل انڈیا منظم کر ڈالا۔ آج تمام صوبوں میں اُن کی تنظیم شاندار ہے۔ ہر صُوبہ کی حکومت کسان کمیٹی سے دبتی ہے۔ اگر ان کے لیڈروں نے عقلمندی سے کام لیا اور مزدور و کسان فیڈریشن بنا کر اپنے نظریّہ کے حاصل کرنے کی کوششیں جاری کر دیں تو ملک بھر میں ہمیں کامیابی

کوئی قیمت محسوس ہو۔ ورنہ اس طرح کئی صدر مجلس بنے۔ اور نہایت زوردار تقریریں کرتے رہے۔ آخر اِن کی میعاد صدارت ختم ہوئی۔ تو پھر نئے صاحب صدر منتخب ہُوئے۔ اور اُن کا بھی وہی حال جو سابقہ اصحاب کا ہوتا رہا۔ آخر ہم مزدوروں کو اس معمول کو توڑنا ہے اور حالات کو خود ہمّت کر کے سازگار بنانا ہے۔ اگر ہم تم مل کر کوئی عملی صورت اختیار نہ کرینگے تو ہمارا پروگرام بے معنی اور بے سُود ثابت ہوگا جس کا نتیجہ ہندی نسل میں کم ہمتی اور بزدلی کا اظہار کریگا۔ نیز ہماری نسلی ترقی کی بجائے قومی انحطاط و تنزّل کا دَور شروع ہو جائے گا۔ اس لئے ہر ساتھی کا فرض ہے کہ اس کانفرنس میں اپنی طرف سے بہتر سے بہترین تجویزیں پیش کرے۔ جو فیصلہ یہاں کر لے۔ اُن پر عمل کرنے کے لئے بھی فوراً تیار ہو جلئے تاکہ ہم ہندوستان کے مزدور بلکہ مزدور جماعت کو سرمایہ دارانہ نظام کے بے پناہ مظالم سے نجات دلا سکیں:

مُلکی حالات حاضرہ پر ایک نظر

مُلک بھر کی جماعتیں اپنی اپنی ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ کانگرس نے سب سے زیادہ ترقی حاصل کی ہے۔ کانگرس ہم مزدوروں کی بھی اس قدر پیاری اور ہمدرد جماعت ہے جس قدر سرمایہ داروں۔ کسانوں کیلئے۔ کیونکہ ہماری ہندوستانی سیاسی حالات کو بدترین منزل سے بہترین درجہ پر لانے والی صرف یہی جماعت ہے۔ تمام جماعتوں کی نمایندہ جماعت جو کہ حکومت کے سامنے ہندوستانی حقوق کے لئے لڑ سکتی ہے۔ صرف یہی واحد جماعت ہے ورنہ کسان سبھا، مزدور جماعت یا سرمایہ دار زمیندار کمیٹی جو کوئی بھی حکومت کے پاس نمایندگی کرے گی وہ صرف اپنی اپنی جماعت کا مقصد و نظریہ پیش کرنے کی مجاز ہوگی۔

یہ ناممکن بات ہے کہ کانگرس کی مانند کوئی ایک موصوفہ جماعت تمام ہندوستانی

ضرور نصیب ہوگی ؞

مزدور جماعت - ہم اپنی تعریف میں کیا کہیں۔ ہم اپنے آپ کو بخوبی جانتے ہیں۔ ہر کام میں ہمارے مزدور مردِ میدان بن کر لڑتے آئے۔ ہم ہی ہیں جو ہر سرمایہ دار کے لئے اپنا خون پانی کی طرح بہا دیتے ہیں۔ چند نفسی ضروریات کے لئے ہم جان تک لڑا دیتے ہیں۔ چند ٹکڑوں کے لئے ہم جوانی کی گھڑیاں ملوں کی جوڑیاں ہلاتے ہلاتے گذار جاتے ہیں۔ فوجوں میں ہمارے خون کی بہار ہوتی ہے۔ ہر جنگ میں ہمارا خون کام آتا ہے۔ ریل۔ ڈاک۔ عمارت گری الغرض پل بنانے جہاز سازی وغیرہ یہ سب ہماری محنت کے کرشمے ہیں۔ دنیا کی ہر سوسائٹی اور دنیا کی تہذیب ہمیں ہمیشہ استعمال کرتی آئی ہے ہم کو ہر طرح ذلیل رکھتی رہی ہے۔ ہم سے ہر طرح خدمات لیکر خود آراستہ و پیراستہ ہوتی آئی ہے۔ سوسائٹی اور نظام دنیا میں اگر ہماری بہرہ داری حاصل نہ کی جاتی۔ تو حیوانات اور چرند اور درندے دنیا کی کسی بستی میں امن قائم نہ ہوتے دیتے۔ مگر ہمارے ساتھ جس قدر بے انصافی اور ناروا سلوک جاری رکھا گیا ہے۔ اس کی سزا ہم اُن مُدبّران نظام سوسائٹی کو دیں گے مگر ابھی تک ہماری طاقت نہیں ہے ؞

ہم جانتے ہیں کہ ہماری جماعت کو ہر قسم کے لوگ ہماری ہمدردی کے نام پر دھوکا دیتے رہے ہیں۔ کہیں کوئی قوم پرست بن کر ہمارے ساتھ فریب کر گیا۔ کہیں کوئی سرمایہ دار ہم کو اپنی ہوشیاری سے سرمایہ دار کے ہاتھ بیچ کر کھا گیا۔ کبھی کوئی خود پرست ہماری سادگی کو اپنے مطلب پر نثار کر گیا۔ کوئی مکار گندم نما جو فروش ہمدردی کے پردے میں ہماری ہڑتال میں غلط مشورہ دے کر ہماری بربادی کر گیا۔ الغرض ہم نے ہر قسم کے لیڈر دیکھے۔ کوئی الیکشن کا مارا ابن الوقت ہمارا نمایندہ بن کر اسمبلی میں چلا گیا۔ کوئی ہمارے نام پر ملازمتیں اور رشوتیں لیتا رہا۔

ملک بھر میں ہماری اقتصادی حالت گو خراب تھی مگر گوناگوں پریشانیوں کے باوجود ہم اپنے میں صحیح ۔ بات اور صحیح نظریہ قائم نہ کر سکے۔ جب تک ہمارے مطالبات اور جذبات صحیح پیدا نہ ہوں اور جب تک ہمارے حالات واقعی انقلاب کے حاجت مند نہ ہوں۔ جب تک ہماری غریبی گھر گھر اپنا پرچار نہ کرے۔ ہر مزدور کو بغیر انقلابی بننے کے کوئی چارہ نظر نہ آئے۔ اُس وقت تک ہمارا کوئی جذبہ صحیح انقلابی جذبہ نہیں بن سکتا۔ ہمارا کوئی مطالبہ انقلابی نہ ہوگا۔ ہمارا کوئی لیڈر صحیح انقلابی لیڈر نہ ہوگا۔ اس امر کی پرواہ نہ کرو کہ ہمارے ساتھ جو سابقہ لیڈروں نے جو غدّاری کی ہے تو یقیناً آئندہ بھی غدّار لیڈر ہی ملینگے۔ نہیں۔ ہمیں ہر غدّار کے اعمال نے دوسرے نئے غدّار سے قدرے محتاط بنایا۔ ہوتے ہوتے ہم آج باقاعدہ اپنے اور دوسرے کے فائدہ میں تمیز کرنے کے اہل بن گئے ہیں۔ اگر ہمارے لیڈر ہم سے چپہ چپہ پر غدّاری نہ کرتے تو ہم اپنے سُود و زیاں۔ نفع و نقصان سے اب تک متعارف نہ ہو سکتے۔

یہ درست سمجھ لو کہ جو انسان ہم مزدوروں میں سے ہوگا۔ وہی صحیح لیڈر ہو سکتا ہے۔ جو ہماری جماعت میں سے نہ ہوگا۔ اُس کو کسی نہ کسی جگہ پر جا کر ضرور کچھ نہ کچھ غلط ثابت ہونا پڑیگا۔ کیونکہ ہمارا حکیم وہی درست حکیم ہے جو کہ مرض کے نشیب و فراز سے آگاہ ہو۔ جس حکیم کو مرض کی صحیح تشخیص ہی نہ کرنی آتی ہو۔ وہ ہماری مرض کا علاج کیا کرے گا۔

اگر ہمارا لیڈر مزدور جماعت میں سے ہے اور خود مزدور ہے تو یقیناً اُسے مزدور کی ہر طرح کی تکلیف اور دُکھ کا علم ہوگا اور وہ ضرور اُس دُکھ کو دُور کرنے کیلئے صحیح کوششیں کریگا۔ مگر جسے دُکھ کا صحیح علم نہ ہوگا۔ وہ لیڈر اگر ایمانداری سے

بھی چلیگا تو وہ ضرور کسی نہ کسی وجہ سے غلط کار ثابت ہوگا۔ اس لئے تم آج سے یہ فیصلہ کر لو۔ جب کب بھی کسی انتخاب مجلس میں حصہ لو تو ہمیشہ اپنی جماعت کے فرد کو منتخب کرو۔

ہماری جماعت آج تک جو کچھ کرتی رہی ہے وہ بھی کسانوں کی طرح غلط کارگذاری کرتی رہی ہے جس کا نتیجہ ہماری موجودہ ناکامیابیاں ہیں ؎

دیکھئے! ہمارا پروگرام یہ ہے کہ ہم مزدور کو . . . . . منظم کریں۔ مزدوروں کی ہمدردی حاصل کرنے کیلئے اُن کی فلاح وبہبود کی تجاویز پیش کریں۔ جس سے مزدوروں کو فایدہ ہو . . . . اور اُن کے حوصلے اور جرأتیں بڑھتی جائیں اور بالترتیب ہماری ہمدردیاں اُس حلقۂ مزدور میں ترقی کرتی جائیں۔ اسی طرح ہمارے نظریئے کو تقویت پہنچتی جائے اور مزدور جماعت ہر رنگ میں ترقی کرتی جائے۔

کوئی ایسی لڑائی نہ لڑی جائے جس کا نتیجہ اس مرکز مزدور یا کارخانہ کی تباہی ہو اور وہ مزدور جس کو ہم ہمدرد اور منظم کرنے گئے تھے جو مرکز ہم نے سمجھ کر اُن کو منظم کرنا تھا۔ جب وہ مرکز ہی تباہ کر دیا گیا تو وہ سب مزدور اب الگ الگ منتشر ہو جائیں گے۔ ہماری تنظیم کا مقصد فوت ہو جائے گا اور ہم بالکل اپنے مقصد کے خلاف کارگذاری کرنے والے ثابت ہوں گے۔ اس لئے جہاں تک ہو سکے۔ آیندہ اس امر کا خیال رکھنا چاہئے کہ کوئی مطالبہ کسی کارخانہ کی حیثیت ومالیت کے خلاف وقت کے تقاضنہ کے علاوہ نہ کیا جائے۔ جس سے ہڑتالیں ہوں اور مزدور بیکار اور کارخانہ فیل ہو جائے۔

موجودہ جنگ اور ہم

اس جنگ کی فتح و شکست کا فائدہ و نقصان شہنشاہیت و آمریت کو ہو گا جرمنی کی فتح سے ہمارا کوئی فایدہ نہیں اور دوسرے فریق کی شکست سے ہمارا کوئی نقصان نہیں۔ اس جنگ سے پہلے ہم جیسے غلام تھے۔ دوران جنگ میں بھی ویسے ہی ہیں۔ تمام دنیا کے مزدور حسب حیثیت اپنی اپنی حفاظت کرنے کے قابل ہیں مگر ہماری حالت دگرگوں ہے۔

ہم میں قوت ہے مگر اس کا استعمال صرف موجودہ دور کے حکمران ہی کرتے ہیں ہماری قربانیاں جب جب مورچہ پر حکم ہو۔ بیشمار ہو جاتی ہیں۔ کسی دوسرے ملک کے مزدوروں کو غلام بنانے پر ہماری جانیں تلف کی جاتی ہیں۔ کہیں کسی کی غلامی سے بچنے کے لئے ہمارے جسم ڈھالیں بنائے جاتے ہیں۔ جب کبھی دشمن کی افواج ہم سے لڑ کر برابر مرتی ہیں تو صلح کے پیغام پر چل پڑتے ہیں۔ آخر ہمارا خون جب سرمایہ دار چاہے۔ شاہی چاہے۔ جہاں چاہے۔ گرا دیتے ہیں۔ خوبی انتظام یہ ہے کہ ہم کسی طرح بھی اپنے میں قوت و جذبہ رکھنے کے باوجود کوئی اپنا فایدہ نہیں کر سکتے۔ اس بے بسی اور بیکسی کی حالت میں ہم ہزاروں کی تعداد جنگ میں کھینچے جاتے ہیں۔ لاکھوں کٹ مرے۔ ہزاروں زخمی ہو گئے اور کئی فہرستیں تیار ہو رہی ہیں۔ ہم تو وہ جانور ہیں جو سرمایہ داری کی ہر ضرورت کے لئے مفید ثابت ہوتے ہیں ؛

جرمنی نے پولینڈ فتح کیا تو ملک کی سیاست میں کوئی فرق نہ آیا۔ جرمنی نے ناروے لیا تو ہمارے ہاں آئینی پابندیاں بڑھ گئیں۔ جرمنی نے بلجیم فرانس کو مار ڈالا۔ روس سے جرمنی کا پہلا سمجھوتہ ہوا۔ تو ہندوستان کے مزدوروں کے

زیادہ ہمدرد سوشلسٹ کمیونسٹ یک لخت گرفتار کر لئے گئے۔ جرمنی نے کوئی جہاز تباہ کیا تو حکومت نے ادھر ہر صوبہ کو سختی سے قابو رکھا۔

کسی فوج نے تنخواہ کی ترقی کا لالچ دیکھا۔ کسی نے واپسی پر ملازمتیں۔ چند ایک نے مجبوریوں کے پیش نظر الغرض ہر مورچہ ہم مزدوروں کی وجہ سے کامیاب رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے مدبران حرب نے جیسا خیال کیا کہ شکست لازمی ہے تو سپاہ کو پس پا کر لیا۔ کسی جگہ جنگ نہ ہوئی۔ اِدھر گئے پھر اُدھر گئے۔ آج سوڈان کل طبروق پر۔ پرسوں کیلئے۔ پھر مالٹا کی طرف۔ کریٹ پر گھمسان کی جنگ ہوئی مگر شکست ہمارے لئے تھی۔ ان سب مراحل کو طے کرنے کے بعد ہم جب سوچتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی نسل کی بالائی جو تھی وہ تو فوج میں چلی گئی ہے مگر ہندوستانی مزدور کی ترقی اور بہتری کا اس موجودہ جنگ سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا ٹرکی اپنی سوچ رہا ہے۔ روس اپنے لئے میدان دیکھتا ہے۔ جاپان چین سے لڑکر ٹھنڈا ہو چکا ہے۔ مسولینی کو یونان نے دشمن کے مقابلے و جرأت سے آشنا کرایا ہے تو یہ باتیں ہم ہندی مزدوروں کے لئے کسی طرح بھی سوچنے کے قابل نہیں۔ کیونکہ نہ تو ہم آزاد ہیں اور نہ ہی ہمارا مُلک۔ اور اسکی آزادی خطرہ میں ہے۔ نہ ہی ہماری حکومت کو کسی دوسری قوم سے کوئی نیکی کی امید ہے۔ نہ ہی ہمارے تجارتی تعلقات کے بگڑنے کا کوئی سوال ہے۔ ہمارے مُلک میں تو روٹی بھی ہر فرد بشر کو نہیں ملتی۔ ہمارے پیٹ تو روٹی کھانے کے لالچ سے میدان جنگ کی گولیاں جا کھاتے ہیں۔ ہمیں غریبی اور بے بسی اس قدر فرصت کہاں دیتی ہے کہ ہم بارودی گولی اور روٹی میں کوئی فرق کر سکیں۔ ہمارے مجبور و مقہور عوام کی بے پناہ تعداد کو دیکھکر ہر مخالف گھبراتا ہے۔ ہم مزدور

کشاں کشاں ہر میدان میں کٹ رہے ہیں تو ہماری غلامی اور مضبوط ہو رہی ہے
اگر ہمارے مالک جیت گئے تو ہم لڑاکے سپاہیوں کو خوب قابو رکھیں گے تاکہ آیندہ
بھی ہم شاہی وقار کو برقرار رکھنے کے کام آسکیں۔ البتہ غلام ہی رکھے جائینگے
اگر مخالف کی فتح ہو گئی جس شدّت سے ہمارے غریب میدان میں جرأت و ایثار
کا اظہار کرتے ہیں اُسی رفتار سے ہمارے مخالف انتقام لیں گے علاوہ ازیں
ہمارے مُلک کا غلّہ۔ خزانہ۔ آدمی جنس وغیرہ سب کچھ جو جنگ میں جا رہا ہے۔ یہ
سب ہمارے ملک کی جایداد غیر مُلک کی حفاظت کے لئے ضائع ہو رہی ہے۔
اس لئے اس موجودہ جنگ کی سیاست اور جنگی چالوں پر اس مضمون میں ہم
بحث کیا کریں۔ جنگ پر تو صرف مدبّر اور صاحب حرب ہی کہہ سُن سکتے ہیں۔
ہماری تو قلم بھی جنگ کے اصلی واقعات پر لکھتے شرماتی ہے کہ جب میں اور
میری قوم کا کسی طرح بھی کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تو جنگ پر کیا کہوں۔

ہاں ایک صورت نظر آتی ہے وہ یہ کہ جب جنگ شدید ہوئی تو حکمران
ہم پر ضرور ظلم و تشدّد اور جبری بھرتی اور جبری وصولی سے کام لیگا۔ اُس
وقت ممکن ہے، عوام بیحد لاچار ہو کر انقلاب و غدر کی تیاری کر لیں۔ تو اس
صورت میں ہمارے مُلک کے مزدور ملکر کوئی منظم بغاوت مزدور جماعتوں کے
ذریعے کریں تو شاید حکومت اپنی بن جائے ورنہ یہ بھی مشکل ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مُلک میں خزانہ اور فوج جب بالکل ختم ہو جائے
اور جنگ اپنے آخری مراحل طے کر رہی ہوگی تو اُس وقت اگر ہماری مزدور
جماعت اچھی منظم شکل میں علم بغاوت بلند کر دے تو بھی ہم ہر طرح اپنے دکھ
کو دُور کرنے کا موجب بن سکتے ہیں وگرنہ سب فتوحات جنگ ہمارے لئے

تو کوئی مفید کام نہیں ہے ۔ موجودہ حکومت نے ہم ہندوستانی مزدوروں کو نہ تو فوجی تربیت مکمل دی، نہ ہی سامان حرب سے روشناس کرایا۔ آخر ہماری بھی کوئی حیثیت ہے جو ہم کسی دوسرے ملک کے مقابل بغیر موجودہ شاہی کے اپنی حفاظت میں لڑ سکیں۔

یہاں ہماری شاہی اپنے ملکوں کی حفاظت نہیں کر سکی۔ ہم نہتے اور بے مایہ لوگ کیا کر سکیں گے۔ اس لئے اس جنگ میں ہم تو خود کو صرف ناکارہ محض سمجھتے ہیں اور بس۔

میری رائے ہے کہ گذشتہ حالات کی رپورٹ جیسی کہ صدر استقبالیہ کمیٹی اور جنرل سکرٹری آل انڈیا مزدور کانفرنس میں درج ہے اُن کو پڑھ کر آپ آیندہ سال کے لئے سبق سیکھیں اور اس کانفرنس میں جو جو کارروائی ہوگی اُن میں پوری دلچسپی و ہمدردی سے غور و خوض کر کے آیندہ سال کا پروگرام مرتب کریں تاکہ ہم اس نازک وقت سے کچھ فایدہ اُٹھا سکیں ؎

یاد رہے کہ اس طرز و انداز میں خطبہ جات لکھے جاتے ہیں۔ قارئین کو یہ خطبہ بطور نمونہ تحریر پیش کیا گیا ہے ؎

کتوں کی کانفرنس

جنگی تاثرات نے ہر جنس پر اپنا اثر آزمایا ہے۔ کیا نازکبدن کیا شاہ وگدا۔ کیا انسان کیا حیوان، کوئی بھی اسکی زد سے نہ بچ سکا۔ چنانچہ ریوٹر کی زبانی یہ خبر ملی ہے کہ جنیوا میں کتوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہوئی ہے جسکے صدر استقبالیہ ڈیوک آف ونڈسر کے کُتے ڈارلنگ ڈیلیگیٹوں کا استقبال کرتے ہوئے اپنا اڈریس یُوں پڑھا کہ مجھے تو جنگ سے چند سال قبل ہی میرے حالات نے مجھے پریشان کر رکھا تھا۔ اسوقت مجھے خواب بہ خیال بھی نہ تھا کہ ہمیں ایسی بھیانک جنگ کا سامنا کرنا پڑیگا۔ میرے آقا کی بھی خواہش یہ تھی کہ دُنیا میں کوئی جنگ نہ ہو۔ تمام بنی نوع انسان بھائیوں کی طرح رہیں۔ قوموں اور ملکوں میں جو تفریق جاری ہے وہ کسی نہ کسی طرح ہٹ جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے امریکہ میں ایک بین الاقوامی امن کمیٹی قائم کی۔ مَیں نے بھی اُن کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنی برادری منظم کروں۔ ابھی میرا کام ادھورا ہی تھا کہ ملک گیری کی ہوس نے تمام بڑی بڑی سلطنتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور اب یہ حال ہے کہ ہمارا جینا بھی دوبھر ہو گیا ہے مَیں صاحب صدر کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جنہوں نے امریکہ کی جنگی مصروفیتوں کے باوجود حضرت روزویلٹ صدر امریکہ جیسی شخصیت سے اجازت حاصل کر کے ہماری دعوت قبول فرما کر ہمیں ممنون احسان کیا ہے۔

علاوہ ازیں مَیں ہندوستانی ریاستوں بالخصوص مہاراجہ پٹیالہ۔ جیند۔ مہارانی منڈی۔ مہاراجہ کشمیر کا ازحد شکر گذار ہوں جو انہوں نے اس آڑے وقت میں اپنے نمائندے بھیجکر دلی ہمدردی کا ثبوت دیا اور برطانوی سلطنت اور دیگر نوآبادیوں کے نمائندوں نے بھی جلسہ کی رونق کو دوبالا کر دیا ہے:

آپ کے بعد صدر کانفرنس روز ویلٹ کے کُتّے نے اپنا جو صدارتی ایڈریس پڑھا۔ تو اُس نے جنگ عالم پر تبصرہ کرتے ہوئے کُتّوں کی حالتِ زار پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ جن حسین نازنینوں کے آگے دل پھینک نوجوان پھرتے پھرتے زندگیاں تباہ کر دیتے تھے ہمارے بھائی بند اُن پیرس کی لیڈیوں کے شریک محفل رہتے تھے ان محبوبوں اور معشوقوں کی گود میں سارا سارا دن پیار میں گذار دیتے تھے جن کے ناموں پر آج کل کے فیشن ایبل نوجوان اور کالجیٹ بن مانگے جانیں فدا کرتے ہیں۔ ہماری نسل کے اعلےٰ اعلےٰ کُتّے شرفا اور رُوسا کی کوٹھیوں اور بنگلوں میں بسیرا رکھتے ہوئے بڑے بڑے وزیروں کے بنگلوں میں اُن کی خاطر و مدارات کی جاتی ہے۔ سرکاری مہمانوں کو وہ لُطف و عیش نصیب کہاں جو ہمیں زندگی میں ملتا تھا سردیوں میں ہم نے گرم ملکوں کے باشی ہوتے اور گرمیوں میں پہاڑوں کی خنک ہواؤں سے لُطف اندوز ہوتے۔ غرض جانور ہونے کے باوجود ہم انسان سے خدمت لیتے تھے۔ چنانچہ سوئٹزرلینڈ، کشمیر جنت نظیر و دیگر صحت افزا مقامات پر ہمارے بھائی بندوں کیلئے کئی کئی ہوس بوٹ وقف رہتے اور ہم ہوائی جہازوں میں بھی پرواز کرتے۔ ہر سفر میں ہمارے لئے آرامگاہیں بنی ہوتیں ہم تیتر بٹیر سے افضل تر ہیں اودھ کے نواب تو تیتروں پر جان چھڑکتے تھے۔ پیرس کی ہر حسینہ اپنے اعلیٰ ترین کُتّوں بلکہ اپنے چہیتے خاوندوں سے زیادہ ہمیں پیار کرتیں اور باقاعدہ متمدن ہستیوں کی طرح ہم زندگی بسر کیا کرتے مگر بُرا ہو اس جنگ کا جس نے ہمیں تباہ کر دیا ہے۔ آج یہ حال ہے کہ مُعزز سے مُعزز نسل کے کُتّوں کو بھی کوئی پُوچھتا نہیں ہے ہمیں اگر زندہ رہنا ہے تو ضرور ایسا پروگرام بنانا ہو گا جس سے ہمارے تمام خطرات ٹل جائیں اور ہم اپنا کھویا ہُوا وقار برقرار رکھ سکیں اور یہ تب ہی ہو سکتا ہے جب دُنیا میں ہم امن قائم کرنے کے اہل ہو جائیں؎

اجلاس کے دوسرے دِن کی کارروائی

اس اہم مسئلہ پر کہ دُنیا میں امن کیسے بحال ہو سکتا ہے۔ بڑے بڑے مُقرروں نے

اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کئی تو اسے ناقابل عمل مسئلہ بتاتے اور کئی سوشلزم میں اسکا حل تلاش کرتے اور چند ڈکٹیٹرشپ کے قائل تھے۔ بعض جمہوریت کی حمایت میں بولے اور بعض نے شہنشاہیت کو سراہا مگر جب ہندوستان کے نمائندوں کی باری آئی تو قائداعظم مسٹر محمد علی جناح کے پالتو جانور نے پاکستانی سکیم کو ہر تجویز سے بہتر بتایا اور اسکی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملادیئے لیکن اسکے جواب میں مرحوم اتاترک کے کتے نے منہ توڑ جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ میرے مالک تمام عمر اس پاکستانی سکیم کیلئے کوشاں رہے مگر مرنے سے چار سال پہلے اعلان کر گئے کہ میں نے اس سکیم کو ہر طرح ناقابل عمل پایا ہے اور ہمارے لیئے یہ زہر قاتل ہے۔ اسلیئے اب میں بلقان کی پانچ طاقتوں کے ساتھ ملکر اپنی قومی و ملکی طاقت کو بڑھانا اپنی زندگی سمجھتا ہوں۔

اس مسئلہ پر مسلم لیگی صاحب بڑے لال پیلے ہوئے اور پُر جوش انداز میں للکار کر بولے غلط ہے ہم بچھڑے ہوئے رہنماؤں کی بات نہیں مان سکتے۔ مرحوم اتاترک آج زندہ نہیں لیکن ہمیں تو زندہ لوگوں کے پروگرام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ پاکستانی سکیم بہت سوچ بچار کے بعد بنائی گئی ہے اور یہی ہماری قوم کی نجات کا باعث ثابت ہوگی۔

اس پر ہاؤس میں ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ حتےٰ کہ صاحب صدر کو بلند آواز میں آرڈر آرڈر پکارنا پڑا۔ اور وہ رولنگ دیتے ہوئے بولے کہ ریزولیوشن کا محرک غلام قوم کا باشندہ ہے اسکے مالک کا گذارہ پرائے ٹکڑوں پر ہے اسکی بھی اپنے مالک کی طرح غلامانہ ذہنیت ہو چکی ہے۔ ہم آزاد بندے کوئی بھی ایسی سکیم جو قابل عمل اور مبنی بر جمہوریت نہ ہو۔ اور کسی ملک کے حصے بخرے کرنے والی ہو۔ قبول نہیں کر سکتے۔

ہندوستان کا دوسرا نمائندہ کانگرسی تھا۔ اس نے مہاتماجی کا عدم تشدد اور چرخہ کا پروگرام ہاؤس کے سامنے رکھا اور کہا کہ اس فلسفہ کو آزمانے سے ہم میں

جھیلنے اور ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کی شکتی پیدا ہو جائیگی مگر غیر ممالک کے نمایندے بیک آواز چلّا اُٹھے۔ ہم دُنیا میں مصیبتیں جھیلنے کے لئے نہیں آئے۔ ہمیں روحانی طاقت حاصل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہمیں تو ایسی قوت درکار ہے۔ جس سے ہماری روٹی اور وقار کی رکھوالی ہو سکے۔

کافی مغز پچی کرنے کے باوجود نمایندے کسی خاطر خواہ نتیجے پر نہیں پہنچ سکے البتہ یہ قرار پایا کہ تمام دُنیا کے کُتّے جرمنی اور اٹلی کے کتوں کے توسط سے ہٹلر اور مسولینی کے پاس صدائے احتجاج پہنچائیں کیونکہ کانفرنس کی رائے ہے کہ ان ہی دو شرارت پسند دماغوں نے دُنیا کے خرمنِ امن پر برق پاشی کی ہے اور ان بین الاقوامی قزّاقوں نے روس جیسے اشتراکیت پسند اور عالمگیر امن کے حامی ملک میں پہنچ کر بھی خاک اور خون کی ہولی کھیلنا شروع کر دی ہے اور جب تک ان ڈکٹیٹری کتوں کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ نہ دُنیا میں انٹرنیشنلزم پنپ سکتا ہے اور نہ ہی جمہوریت کے ارتقا و بقا کے لئے کوئی مؤثر قدم اُٹھایا جا سکتا ہے۔

اس آخری تقریر پر چند نیشنلسٹ مسلمانوں نے جن کا وفد امریکہ اور یورپ کی سیر و سیاحت کو گیا تھا۔ آمین ثم آمین کے نعرے بلند کئے اور یہ بین الاقوامی کانفرنس بخیر و خوبی سرانجام پائی ۔

—— ۱۵ ——

13. ساڑی